حیاتِ محمُود

﴿تلخیص و تجدید﴾

طاہرمحمود

[2020]

پیش لفظ

احقر کے والد ماجد مرحوم ومغفور کی وفات کو اس سال دسمبر میں پینتالیس سال پورے ہو جایں گے۔ مکّہ معظّمہ میں انکے حادثۂ وصال کے بعد ہم نے ''حیات محمودؔ'' کے عنوان سے انکی سوانح حیات لکھی تھی اور ۱۹۷۷ء میں اس کے کئی سو نسخے اپنے ذاتی اخراجات سے طبع کرواکے اقارب واحباب اور دیگر قدردانوں کو تحفتاً بھیجے تھے۔ کسی پیشہ ورانہ ناشر یا کتب فروش کو یہ تصنیف اس لئے نہیں دی تھی کہ اس سے کسی کا بھی کوئی مالی فائدہ اٹھانا ہمیں قطعاً منظور نہیں تھا۔ اب وہ نسخے کہاں کہاں کس کس کے پاس موجود ہیں ہمیں اسکا علم نہیں ہے۔ بہر حال اس سال کے وسط سے اب تک بعض اعزّاء واحباب نے اس میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے اور اسکے کچھ نسخے پھر سے طبع کروانے کی تجویز کئی بار ہمارے سامنے رکھی گئی ہے۔

اردو ہماری مادری اور پدری زبان ہے اور ساری زندگی ہم نے اردو بولی، پڑھی اور لکھی ہے۔ ''حیات محمودؔ'' کے موضوع کتاب یعنی والد محترم کے افکار و سوانح پر اپنی بعد کی متعدّد کتابوں میں بھی ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں جب ہماری چوتھی کتاب ''جرأت رندانہ (نظریات وشخصیات)'' شائع ہوئی تو اس میں ہم نے اپنے والدین پر ایک مضمون ''وبالوالدین احساناً'' کے عنوان سے شامل کیا۔ چار سال بعد انگریزی میں ہماری اپنی خودنوشت شائع ہوئی جسکا پہلا باب بھی ہمارے والدین کے تفصیلی تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس باب کی اردو تلخیص ہم نے ۲۰۰۹ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''قصّۂ درد سناتے ہیں'' میں شامل کی۔ دو سال بعد چھپنے والی ہماری اگلی کتاب ''ہم دشت میں دیتے ہیں اذاں'' کے آخر میں ایک طویل ضمیمہ ہے جو ہماری مذکورہ خودنوشت پر مبنی ہے۔ اس سب کے پیش نظر ہمیں اپنی تینتالیس سال پرانی تصنیف ''حیات محمودؔ'' کو پھر سے طبع کروانا بے معنی سی بات لگی۔ لیکن ہماری دیگر سبھی کتابیں جو خاصی ضخیم ہیں اور ہمارے مقالات اور تقاریر کا مجموعہ ہیں ان میں خاندانی تاریخ کا ذکر ضمناً اور مختصراً ہی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ''حیات محمودؔ'' سے استفادہ کرنے کے متمنّی احباب کو ہم اپنی ان سب تصانیف کی خوشہ چینی کرنے کی زحمت تو نہیں دے سکتے۔

اس پس منظر میں ہم نے یہ مختصر کتابچہ تیّار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ''حیات محمودؔ'' کا اجمالی خاکہ بھی ہے اور اسکے بعد کی اپنی دیگر کتابوں میں ہم نے اپنے اسلاف، والدین اور وطن پدری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسکا لبّ لباب بھی۔ اسکے علاوہ اس کتابچے میں والد محترم کے لئے بعض اکابرین اور اصحاب کے خراج ہائے تحسین بھی شامل ہیں اور انکی وفات پر لکھی گئی چند نظمیں بھی جو لکھنے والوں کی ان کیلئے بے پناہ عقیدت کی مظہر ہیں، اور یہ سبھی چیزیں ''حیات محمودؔ'' ہی سے لی گئی ہیں۔

ہم خود کوئی باقاعدہ شاعر نہیں ہیں لیکن بچپن سے ہی اشعار سنتے سناتے پڑھتے پڑھاتے خود بھی ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے لگے تھے۔ زندگی میں کبھی بھی نہ علم عروض پڑھا نہ فنّ شعر گوئی سیکھا اور نہ کسی کے آگے زانوئے تلمّذ تہہ کیا، بحر و بر سے بے نیاز اپنے احساسات کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ چنانچہ ہماری شاعرانہ جرأتوں میں ہر طرح کی خامیاں ملتی ہیں جن سے ہم خود بھی واقف ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر پیش آنے والے خوشی اور غم کے واقعات پر ہم نے منظوم اظہار خیال کیا ہے۔ نظموں کی شکل میں ہم نے وقتاً فوقتاً اپنے اسلاف، والدین اور وطن پدری کو جب کبھی جو بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اسے اس کتاب کے آخر میں شامل کرنے کی جرأت کر رہے ہیں، اس امّید پر کہ انکی لسانی اور عروضی خامیوں سے قطع نظر ان میں مضمر جذبات پر غور کیا جائے گا۔

اب سے تینتالیس سال پہلے تیّار کردہ ہماری تصنیف ''حیات محمودؔ'' ہی کی طرح یہ کتابچہ بھی کسی پبلشر کو اشاعت و فروخت کیلئے نہیں دیا جائے گا کیونکہ اسے ہمارا ضمیر کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسے ہم اپنے نجی کمپیوٹر پر خود ہی تیار کر رہے ہیں۔ مکمّل ہو جانے پر فی الحال انشاءاللہ پی ڈی ایف فائل کی شکل میں دلچسپی رکھنے والے صاحبان کو بھیجا جائے گا اور اگر ضروری ہوا تو اس کی طباعت کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔

طالب دعا

طاہر محمود

نئی دہلی، ۱۸ ستمبر ۲۰۲۰ء

****

مشمولات

۱۔''حیات محمود'' کا پہلا ایڈیشن	۳
۲۔عظمت اسلاف	۵
۳۔ پدرم بیشتر از صدا تالیق	۷
۴۔سیرت فرزند ہا از امّہات	۱۱
۶۔قرآن کریم کی بیسک ریڈر	۱۳
۷۔وصیّت بنام ملّت اسلامیہ ہند	۱۵
۸۔خراج ہائے تحسین	۱۷
مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا ہاشم فرنگی محلی ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی	
محمود الحسن ندوی ۔سیّد ساغر مہدی ۔عبرت بہرائچی	
۹۔منظوم گلہائے عقیدت	۱۹
نعیم اللہ خیالی۔ انجم صدّیقی۔ شاردا پرشاد شیدا	
مصطفیٰ حسن تاثیر۔ نامعلوم شاعر	
۱۰۔ منظومات مصنّف	۲۱
نذر اسلاف۔ دادا حضور کیلئے ۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں	
حرم کا مہمان۔ یاد ماضی۔ جنون جذبات۔زیارت مزار۔ نذر وطن	

****

(۱)

''حیاتِ محمود'' کا پہلا ایڈیشن

اپنے والد بزرگوار کے افکار و سوانح پر ہماری تصنیف ''حیاتِ محمود'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء چھوٹے سائز کے ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے ذیلی عنوان ''ممتاز ملّی قائد شہید حجاز مولوی سیّد محمود حسن مرحوم کی سوانح حیات'' تحریر ہے۔ کتاب کے اندر پہلے صفحے پر والد محترم کی تصویر ہے جسکے اوپر ''زاہد غریق رحمت'' لکھا ہے جس سے انکی وفات کی تاریخ نکلتی ہے اور نیچے ایک شعر ''افسوس بھلا ایسا ملتا ہے کہاں انساں، جو قال میں زاہد ہو اور حال میں ہو سرمد''۔ یہ شعر دہلی کے ایک بزرگ جناب مصطفیٰ حسن تاثیر کی اس نظم کا ہے جو انھوں نے والد صاحب کی وفات پر لکھی تھی، اور تاریخ وفات بھی انھیں کی نکالی ہوئی ہے۔ کتاب کے اگلے صفحے پر ہمارا پیش لفظ ہے جو نیچے نقل کیا جا رہا ہے۔

> ''اس کتاب کے مصنّف کی حیثیت سے ہمیں چند مختصر باتیں عرض کرنی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ یقیناً امر واقعہ ہے کہ جس عظیم شخصیت کے حالات زندگی ہم قلمبند کر رہے ہیں وہ بے شک و شبہ ان دیدہ ور ہستیوں میں سے تھی جو نرگس کے ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہیں اور اپنے کردار اور خدمت خلق کا نقش دوام چھوڑ کر دنیا سے واپس جاتی ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف مخالفین، موافقین اور غیر جانبدار لوگ سبھی کو ہمیشہ رہا اور اب بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ جس جیّد ہستی کی حیات پر تنویر اس کتاب کا موضوع ہے اس کا فرزند ہونے کا فخر ہمیں ضرور حاصل ہے لیکن آسمان سے خاک کی اس نسبت نے کتاب کے مواد اور تفصیلات کو بے جا طور پر متاثر نہیں کیا ہے۔ پوری کتاب میں صرف حقیقت نگاری ملحوظ رہی ہے۔ اسکے کچھ حصّے تو ان واقعات پر مبنی ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آئے تھے اور بقیہ ان حقائق سے ماخوذ ہیں جو ہم نے وقتاً فوقتاً موضوع کتاب کی زبان مستند سے بار بار سنے تھے۔ آخری باب میں شامل گلہائے عقیدت کی بغور خوشہ چینی کر کے کوئی بھی یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ واقعات کے بیان کرنے میں ہم سے کوتاہی تو ضرور ہوئی ہے سہو نہیں ہوا۔ ہمارے کئی بزرگوں نے ہمیں اس کتاب کی ضرورت کا احساس دلایا بلکہ اسکی تالیف کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے اس فرض کی تکمیل حتیٰ المقدور کر دی ہے۔ یہ مختصر تالیف جامع یا محتوی ہرگز نہیں ہے۔ موضوع کتاب پر تو جناب اقبال عظیم کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ ' قدم قدم پہ مرتّب ہوا ہے افسانہ، جدھر سے گزرتا گیا ہے پروانہ'۔ اس افسانہ در افسانہ زندگی کو مکمّل طور پر احاطۂ قلم میں لے آنا اس عاجز کے بس میں نہیں ہے۔ زیر نظر کتاب ایک بحر بیکراں سے لئے گئے چند قطرات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ ہمیں پورا یقین اور اطمینان ہے کہ وہ نادر زندگی کسی سوانح نگار کے قلم کی محتاج نہیں ہے، موجودہ نسل میں بے شمار لوگ اسکے مختلف پہلوؤں سے مصنّف کی بہ نسبت کہیں زیادہ واقف ہیں، انھیں یہ کتاب ایک نامکمّل مرقّع ہی معلوم ہوگی۔ البتّہ آنے والی نسلوں کو یہ کتاب ماضی کی ایک عظیم ہستی سے متعارف کروانے میں ضرور معاون ہوگی اور یہی اس تالیف کا مقصد ہے۔''

پیش لفظ کے نیچے اسکی تاریخ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء لکھی ہوئی ہے جو دراصل والد مرحوم کی دوسری برسی تھی۔ ہم نے یہ کتاب اس سال اپریل میں لکھنی شروع کی تھی اور جلد ہی مکمّل کر لی تھی مگر اگست میں ہمیں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے کناڈا کا سفر درپیش تھا اور ارادہ تھا کہ مکّہ معظّمہ میں انکی آخری آرامگاہ پر حاضری دینے کی غرض سے سعودی عرب کے راستے وطن واپس آیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری خواہش پوری کی اور ہمارے بچپن کے دوست مولوی رضوان بیگ نے جو اس وقت وہاں مقیم تھے اور والد مرحوم کی تدفین میں شریک تھے ہمیں جنت المعلیٰ لے جا کر انکے مدفن کی نشاندہی کی اور ہم نے کتاب کا مسودہ قبر کے پاس رکھ کے اپنے حساب اسکی اشاعت کی اجازت حاصل کر لی اور بالآخر سال کے آخر تک کتاب چھپ گئی۔ اسکی کتابت علی گڑھ اور طباعت دہلی میں ہوئی تھی جسکی مکمّل تفصیل اسکے آخری صفحے پر درج ہے۔ اور وہاں جلی حروف میں یہ عبارت بھی تحریر ہے کہ ''کتاب بلا قیمت بطور ہدیہ پیش کی جائے گی''۔

بہرائچ کے معروف عالم دین مولانا سلامت اللہ قاسمی مرحوم و مغفور سے والد مرحوم کے دوستانہ مراسم تھے۔ ہم نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تو انھیں خط بھیج کر درخواست کی وہ اس کیلئے مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات مختصراً تحریر فرما دیں۔ درخواست قبول ہوئی اور مطلوبہ تحریر ''آہ سیّد محمود حسن، احسن الله مثواہ'' کے عنوان سے موصول ہوئی جسے ہم نے کتاب کے ''تعارف'' کے طور پر استعمال کیا۔ اصل کتاب کے صفحات ۵ تا ۱۱ پر موجود مولانا کی نادر تحریر ذیل میں نقل کی جا رہی ہے۔

> ''مخدوم و مقتدیٰ جناب سیّد محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ، اللہ تعالیٰ انکی بال بال مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ سکون و سکینہ نصیب فرمائے، ہم سب کیلئے عظیم نعمت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے موصوف کو دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے بے حد اہم شخصیت کا مالک بنایا تھا۔ ہر کہہ و مہہ چاہے وہ کسی مذہب کا ہو، کسی مشرب کا ہو، انکو انتہائی عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اپنے پرائے سب میں مقبول تھے، سب کے دلوں میں محمود اور سب کی زبانوں پر ممدوح تھے، حقیقتاً اور یقیناً اسم با مسمّی تھے۔

دینی اور فقہی علوم سے بےحد شغف تھا، فقہ اور تفسیر پر دسترس حاصل تھی۔ قرآن پاک اور اسکے تراجم کا مطالعہ انکا بےحد محبوب مشغلہ تھا۔ قرآن پاک خود بہت صحیح پڑھتے اور دوسروں کو بھی اسکی ترغیب دیتے تھے۔ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اوروں کو سبقاً سبقاً قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ چنانچہ انکی اولاد میں آج سبھی موجودہ زمانے کے عام حفاظ سے کہیں بہتر اور صحیح تلاوت پر قادر ہیں۔ خیرکم من تعلّم القرآن ایک مستند حدیث ہے، انکے عمل صالح نے مرحوم کو اس حدیث کا مصداق بنادیا اور وہ آج بہ فضل اللہ خیار امّت کے زمرے میں ہوں گے۔ سنن نبویہ علیٰ صاحبها الف الف صلوٰة والسلام کی مرحوم کو ہمیشہ تلاش رہتی تھی۔ کسی امر میں کوئی حدیث سنتے یا پڑھتے، کہیں کسی دعاء ماثور کا ذکر آتا فوراً اسے یاد کر لیتے تھے۔ جب تک جسم نحیف میں توانائی رہی مسجد میں باجماعت نماز کا اہتمام رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انکو مومنانہ جرأت بدرجۂ اتم بخشی تھی۔ قول حسن ہمیشہ انکا شیوہ رہا، کسی کے سامنے قول حق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ جذبۂ توحید رگ و پے میں سرایت تھا اور اسکا مظاہرہ قول و عمل سے برابر ہوتا رہتا تھا۔ اس وصف میں وہ اپنی مثال آپ تھے اور بےشک لا یخافون باللہ لومۃ لائم کی زندہ تفسیر تھے۔ وکالت کا پیشہ صلحاء کے نزدیک دینی اعتبار سے بےحد مجروح ہے اور اسکی وجہ محتاج بیان نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت نے زندگی کے اس شعبے میں بھی انکی رہنمائی کی اور کردار کی بلندی، سچائی اور صفائی انکے پیشے میں بھی نمایاں رہی۔ حالانکہ یہ صفات اس پیشے میں ناقابل عبور گھاٹی سمجھی جاتی ہیں لیکن مرحوم ہمیشہ وہی مقدمات لیتے تھے جن میں سچائی کا عنصر غالب تر ہوتا۔ حقدار کو اسکا حق مل جائے، مظلوم کی پوری طرح دادرسی ہوجائے یہی مقصد مقدمات میں پیش نظر رہتا تھا۔ درمیان قعر دریا رہتے ہوئے بھی دامن تر ہونے سے بچایا اور ہمیشہ ہشیار باش پر مکمّل طور سے عمل پیرا رہے۔ مرحوم کی کون کون سی خوبیاں بیان کی جایں، انکا احاطہ مجھ نافہم کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجملاً اتنا کہہ سکتا ہوں کہ زبان صادق، قدم ثابت، یقین محکم اور عمل پیہم کے بہترین شاہکار تھے اور بہت اچھے انسان تھے۔ انکا نام محمود، کام محمود، انجام محمود۔ وہ اللہ کو ایسے پیارے ہوئے کہ انکو اپنے دیار میں بلایا گیا، اپنی دیوار کے سائے میں بٹھایا گیا اور ہمیشہ کیلئے اپنے جوار میں بسالیا گیا۔ یہ عنایات انکی کس مخصوص نیکی کا ثمرہ ہیں خدا ہی کے علم میں ہوگا۔ اس ناچیز کی عقل کہتی ہے کہ مخلصانہ حق نوازی اور رندانہ توحید پرستی کا یہ مقدس ثمرہ ہے جو انکو ملا ہے۔ ان جیسے مومن قانت کی زندگی اور حیات پاکیزہ کا یہی بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اللھم اغفر له و ارحمة رحمته و ادخله فی جنّت النعیم، آمین ثمّ آمین۔ یہ چند حقیر کلمات اگرچہ مرحوم کا حق مدح ہرگز ادا نہیں کرتے مگر ارشاد نبوی اذکرو محاسن موتاکم کی تعمیل میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود عزیز والا مراتب خلف رشید ڈاکٹر طاہر محمود صاحب کی مرتّب کردہ مرحوم کی سوانح کیلئے تحریر کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔''

(محمّد سلامت اللہ غفر له)
مدرسہ نور العلوم، بہرائچ
۲۲ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۹۷ھ مطابق ۳ مئی ۱۹۷۷ء

گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں ہماری تصنیف کردہ کتاب ''حیات محمودؒ'' علی گڑھ کے ایک سلطان احمد نامی کاتب کے قلم سے جلی حروف میں لکھی ہوئی ہے جسے اگر آج کمپیوٹر سے دوبارہ کمپوز کیا جائے تو اسکی ضخامت شاید ایک تہائی رہ جائے گی۔ اصل کتاب حسب ذیل عنوانات والے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ خاندانی اور ابتدائی حالات	۲۔ پیشہ اور عوامی زندگی
۳۔ سیاسی سرگرمیاں	۴۔ دینی، تعلیمی اور سماجی خدمات
۵۔ عقائد، نظریات اور کردار	۶۔ سفر حج اور وفات
۷۔ وصیّت	۸۔ گلہائے عقیدت

ان سبھی ابواب کے مشمولات کو ہم اپنی بعد میں شائع ہونے والی دیگر تصانیف میں شامل متعلقہ مواد کے ساتھ ملا کر اس کتابچے کے صفحات پر بالاختصار اور بہ انداز دگر منتقل کررہے ہیں۔ پرانی ''حیات محمودؒ'' میں مذکور ہمارے ممدوح کے افکار و سوانح کا کوئی گوشہ انشاءاللہ اس مختصر کتابچے میں خارج الذّکر نہیں رہے گا بلکہ نئے اضافے اسے اسکا جدید ایڈیشن بنادیں گے۔

****

(۲)

عظمت اسلاف

برّ اعظم یورپ کے قدیمی ملک انگلستان کے باشندے سترھویں صدی عیسوی میں تجارت کی غرض سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے مگر ہوس ملک گیری میں آہستہ آہستہ اس عظیم الشان ملک کے جابر وظالم حاکم بن بیٹھے تھے۔ بنگال سے شروع کرکے انھوں نے بتدریج آگے بڑھتے بڑھتے پورے ملک پر قبضہ کرلیا تھا۔ مشرقی ہندوستان میں انھوں نے تاج محل کی عالمگیر شہرت کے باعث پہلے آگرہ شہر اوراس کے قرب وجوار پر قبضہ کیا اور پھر تہذیب وثقافت کے مشہور عالم مرکز اودھ کا علاقہ بھی ہتھیا لیا۔ آگے چل کر انھوں نے ملک کے ان دونوں علاقوں کو ملاکر ایک صوبہ بنایا اور اسے یونائیٹڈ پراونسز آف آگرہ اینڈ اودھ (ممالک متحدہ آگرہ واودھ) کا نام دیا جو اپنے انگریزی نام کے مخفف ''یوپی'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔ آزادی کے بعد صوبے کے اس مختصر نام کو باقی رکھنے کی خاطر اسے ''اتر پردیش'' کا نام دیا گیا۔ ہمارے خاندانی پس منظر میں اس صوبے کے مشرقی اور مغربی دونوں حصّوں کی روایات وثقافت کا امتزاج رہا ہے۔

ہمارے اسلاف پدری کا تعلق صوبہ اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے دو مردم خیز قصبوں جائس اور نصیر آباد سے تھا۔ اس خاندان کے جدّ امجد کا اسم گرامی سیّد خان عالم تھا جو کہ تاریخی حساب کتاب سے مغل شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں کے دور حکومت میں وقت کی معروف ادبی شخصیت ملک محمّد جائسی کے ہم عصر رہے ہوں گے۔ حضرت خان عالم علیہ الرحمۃ کی کی اگلی چار پشتوں کے بزرگوں کے اسمائے گرامی جو ہمارے خاندانی شجرے میں مذکور ہیں سیّد بدر جہاں، سیّد شیر محمّد، سیّد محمّد حسن اور سیّد فضل حسن تھے مگر انکے کوائف حیات کا ہمیں علم نہیں ہے۔ رضی اللہ علیہم اجمعین۔

سیّد خان عالم علیہ الرحمۃ کی پانچویں پشت میں مخدوم ما سیّد ہادی حسن مرحوم ومغفور ہمارے پردادا تھے جو انّیسویں صدی کے اواخر میں جائس سے بہ سلسلۂ ملازمت ہجرت کرکے اودھ کے قدیم شہر بہرائچ میں آبسے تھے جو کسی زمانے میں اس علاقے کا مرکزی شہر تھا، اور اس طرح یہ تاریخی شہر جس کی زمین کے نیچے نہ جانے کتنے اولیاء کرام ابدی نیندسو رہے ہیں اور جس نے نہ جانے کیسے کیسے مہ پاروں کو جنم دیا ہے ہمارا پدری وطن بن گیا۔ بہرائچ مشرقی ہندوستان کا وہ قدیم خطّہ ہے جسکا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بھی ہے اور اردو کے قدیم شعراء کے کلام میں بھی۔ یہی وہ شہر ہے جہاں سیّد الشہداء سیّد سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کا مدفن ہے جسکی بدولت اسے عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔

بہرائچ میں ہمارے پردادا حضور سیّد ہادی حسن نوّر اللہ مرقدہ ریاست کپورتھلہ کے تنظیمی عملے میں صدر منصرم کے عہدے پر فائز تھے اور ایک دینی اور علمی شخصیت کی حیثیت سے انکی شہر اور اسکے مضافات میں بڑی عزّت تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جہان فانی سے رخصت ہوکر شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے سامنے موجودہ نمائش گراؤنڈ کے ایک گوشے میں مدفون ہوئے۔ اس اسکول میں ہماری ابتدائی تعلیم کے زمانے میں انکی آخری آرامگاہ محفوظ تھی اور ہمیں کئی بار اسکی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی پہلی زوجہ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی تھی اور جب مشیّت ایزدی سے وہ بھی نہیں رہی تھیں تو ایک بار پھر رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے تھے۔ یہ تینوں محترم بیبیاں انکے آبائی وطن ضلع رائے بریلی کے مختلف قصبات کے معزز خاندانوں سے تعلّق رکھتی تھیں۔

پہلی اور دوسری زوجہ سے پردادا حضور کے ایک ایک صاحبزادے (سیّد احمد حسن اور سیّد محمّد حسن مرحومین) تھے۔ تیسری رفیقۂ حیات سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک بیٹی (سیّدہ محمّدی خاتون) اور تین بیٹے (سیّد رضی حسن، سیّد علی حسن اور سیّد احمد بشیر) عطا کئے تھے جن میں سے پہلے دونوں بیٹے عہد جوانی میں دنیا سے رخصت ہوگئے تھے اور تیسرے بیٹے ڈاکٹر احمد بشیر مرحوم شہر گونڈہ میں ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرتے تھے۔ سیّدہ محمّدی خاتون مرحومہ کے شوہر سیّد محمد حسین کاظمی مرحوم ایک کامیاب وکیل تھے۔ رائے بریلی میں قصبہ جائس کے باسی تھے مگر گونڈے میں مقیم تھے اور بعد میں ضلع کی قدیمی ریاست بلرامپور منتقل ہوگئے تھے۔ رحم اللّٰہ علیہم اجمعین۔

****

پرداداحضور کے خلف اکبر مخدوم بندہ سیّد احمد حسن مرحوم ومغفور ہمارے دادا تھے جو شہر کے ایک مشہور ومعروف طبیب بھی تھے، اور ایک جیّد عالم دین اور حافظ قرآن بھی۔ وہ اور انکے اہل خانہ محلّہ قاضی پورہ میں واقع ایک پرانی وضع کے مکان میں رہتے تھے جسکے باہری حصّے میں انکا مطب تھا جہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ہر آنے جانے والے کو عربی زبان سیکھنے کی تلقین کرتے تھے جس پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی اور خالی اوقات میں خود اپنے تیّار کردہ عربی کے ایک سہ ماہی کورس کے باقاعدہ کلاس لیتے تھے۔ عہد مغلیہ کی یادگار شہر کی جامع مسجد قریب ہی واقع تھی مگر انھوں نے محلّے کے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹی سی مسجد کو جو فاطمہ کی مسجد کہلاتی تھی اپنی کفالت میں لے رکھا تھا اور نماز پنجگانہ کے علاوہ وہاں جمعے کی نماز کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر خود امامت فرماتے تھے اور ایک سال رمضان المبارک میں وہاں تراویح کی نماز میں پورا کلام پاک سنایا تھا جسکا ذکر خود انکے قلم سے مسجد کے طاق میں رکھے ہو کلام مجید کے ایک نسخے پر لکھا ہوا بچپن میں ہم نے خود بصد احترام وعقیدت دیکھا تھا۔ ایک بار حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر صحت کی اچانک خرابی سے راستے سے ہی واپس آنا پڑا۔ اگست ۱۹۴۴ء میں انتقال فرمایا اور اسٹیشن روڈ پر واقع حضرت شاہ بڈّھن رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے۔ ہم اس وقت اوائل طفلی میں تھے مگر پتہ نہیں کیسے صاف شفاف سفید کپڑوں میں ملبوس اپنے گھر کے صحن میں تخت پر نماز پڑھتے ہوئے انکی فرشتہ صورت شبیہ ہماری یادداشت کے کسی گوشے میں اب تک محفوظ ہے۔ دادا حضور کی شادی ضلع رائے بریلی کے مشہور ومعروف قصبے نصیر آباد کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ انکی وفات کے ڈھائی سال بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں دادی حضور نے بھی دنیا سے پردہ فرمایا تھا۔

دادا حضور کو خدا نے چار بیٹیاں (سیّدات امّ سلمیٰ خاتون، سلیمہ خاتون، حمیدہ خاتون اور سعیدہ خاتون) اور پانچ بیٹے (سیّد مصطفیٰ حسن، سیّد مرتضیٰ حسن، سیّد محمود حسن، سیّد سعید حسن اور سیّد مسعود حسن) عطا فرمائے تھے۔ بڑے بیٹے سیّد مصطفیٰ حسن اور منجھلے بیٹے سیّد مرتضیٰ حسن مرحومین دونوں یو پی گورنمنٹ کے شعبۂ مالیات کی سروس میں تھے اور مختلف شہروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں سے بڑے بھائی نے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد قرآن حفظ کیا اور ۱۹۵۶ء میں جونپور کی تحصیل کراکت میں چھوٹے بھائی کے گھر پر انتقال کیا جو اس وقت وہاں افسر اعلیٰ تھے۔ ہم اسی دن اتفاقاً وہاں پہونچے تھے اور ہمیں ان کا آخری دیدار بھی نصیب ہوا تھا اور تدفین میں شرکت کا موقع بھی ملا تھا۔ سیّد مرتضیٰ حسن صاحب نے رٹائرمنٹ کے بعد شہر گونڈہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے خلیفہ اجل حضرت شاہ وصی اللہ مرحوم سے بیعت کی اوکئی بار الہٰ آباد جا کر انکے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ دینی کتب کا مطالعہ کیا اور جلد ہی حج بیت اللہ سے مشرّف ہوئے۔ ہمارے سر پر انکا دست شفقت ہمیشہ ہی رہا، ۱۹۵۵ء میں ہم چند ماہ جونپور میں انکے سایۂ عاطفت میں رہے تھے، اور پھر مدّتوں بعد دہلی میں ہمیں اپنے غریب خانے پر انکی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوتھا۔ بے حد وجیہ، مرنجا مرنج، خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ۱۹۸۱ء یا شائد اسکے اگلے سال شہر گونڈہ میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

دادا حضور کی تیسری بیٹی سیّدہ حمیدہ خاتون مرحومہ کے شوہر جناب مولوی محمّد عثمانی مرحوم الہٰ آباد کے دائرہ شاہ اجمل کے ایک معروف علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور خود ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ عالم فاضل شخص تھے۔ وہ ان دینی لوگوں میں سے نہیں تھے جنھیں احتراماً مولوی کہا جاتا ہے بلکہ ''مولوی'' انکے نام کا حصہّ تھا۔ یو پی سرکار کے شعبۂ تعلیم میں رہے اور مختلف شہروں کی درگاہوں میں درس وتدریس کے بعد رامپور میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ بڑے زبردست موٴحد اور ہر قسم کے شرک کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے ''انوار القرآن'' کے عنوان سے اردو میں قرآن کریم کی تین جلدوں پر مشتمل مفصل تفسیر لکھی، ''انسان کامل'' کے نام سے تین ہی جلدوں میں رسول اکرمؐ کی سیرت طیّبہ مرتب کی، شرک وبدعت کی روایات پر سخت تنقید کرتے ہوئے ''ضرب خلیل'' اور ''فرمان خدا'' نامی دو کتابیں اور لکھیں اور آخر میں ''کتاب وحکمت'' کے عنوان سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک سیریز میں لوگوں کے غلط عقائد پر تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے مستند حوالوں سے انکی نئی تشریحات پیش کیں جن پر انھیں بعض دینی حلقوں کے غیظ وغضب کا شکار بھی ہونا پڑا۔ شعر وشاعری میں بھی دلچسپی لی اور اسکے ذریعے بھی اصلاح معاشرہ کی کوشش کی۔ حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرّف ہوئے اور مدینے میں اپنی حاضری کا تذکرہ ایک شعر میں یوں کیا کہ ''شرک سے پاک رہا پھر بھی ادب سے میں نے، روضۂ پاک نبی گنبد خضریٰ دیکھا''۔ درگاہوں اور بزرگوں کے مزارات میں ہونے والی بدعقیدگی پر ایک دفعہ انھوں نے یوں ضرب کاری لگائی تھی کہ ''یہ عرس وسجّادگی کے جھگڑے تمامتر کاروبار شیطاں، رسوم نذر ونیاز وبیعت نہیں بجز مشق تاجرانہ''۔ اپنے ان بزرگ عزیز سے ہمیں بہت عقیدت تھی اور وہ بھی ہمارے ساتھ غیر معمولی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ دہلی کے جامعہ ہمدرد میں اپنے شعبے میں منعقدہ کئی مذاکرات میں ہم نے انھیں بھی زحمت دی تھی اور غریب خانے پر انکی میزبانی کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ خدائے پاک نے طویل عمر سے نوازا اور بالآخر تقریباً سو برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ رحم الله عليه ۔

****

(۳)

پدرم بیشتر از صد اتالیق

دادا حضور حکیم سیّد احمد حسن علیہ الرحمۃ کے تیسرے بیٹے سید محمود حسن مرحوم و مغفور احقر کے والد ماجد تھے۔ وہ ۳ ستمبر ۱۹۰۳ء کو بہرائچ میں پیدا ہوئے تھے اور انکا اسم گرامی دادی حضور کو خواب میں ملی بشارت کے مطابق دیوبند کے بزرگ عالم دین اور شیخ الحدیث مولانا محمود حسن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بڑے ہونے پر کھیل تماشوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور کم عمری میں ہی قرآن پاک کے تراجم، احادیث نبوی کے مجموعے، دین و فقہ کی مستند کتابیں سب ہی کچھ پڑھ ڈالا اور عربی و فارسی زبانوں پر قدرت حاصل کر لی۔ بہرائچ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے جہاں وہ چھ سال زیر تعلیم رہے۔ عربی میں ایم اے اور وکالت کی ڈگریاں لے کر وطن واپس آئے اور وکالت شروع کی۔ چند سال بعد محلّہ قاضی پورہ میں ایک بڑا پلاٹ خرید کر اس پر اپنی کوٹھی بنوانی شروع کی جو ۱۹۳۷ء میں مکمّل ہوئی۔ بیرونی برآمدے کی پیشانی پر انھوں نے ایک کتبہ لگوایا جس پر کلام پاک کی آیت کلّ من علیها فان و یبقیٰ ذوالجلال والاکرام کندہ تھی۔ دین و شریعت کے مسائل میں گہری دلچسپی تو شروع سے تھی ہی، جلد ہی وقت کے ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور انکی تصنیف تفسیر بیان القرآن کا برسوں تک گہرائی سے مطالعہ کرتے رہے۔

وکالت کے میدان میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور جلد ہی انکا شمار قرب جوار کے چوٹی کے ماہرین قانون میں ہونے لگا۔ بہرائچ اور دیگر اضلاع کی مقامی عدالتوں کے علاوہ لکھنؤ میں واقع اودھ چیف کورٹ (عدالت عالیہ) میں اپیلوں کی پیروی کی اور یہ سلسلہ آزادی کے بعد اس عدالت کے الہ آباد ہائی کورٹ کی بینچ بن جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ قانون دانی کے میدان میں اس قدر شہرہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے انھیں ''وکیل بے عدیل'' کے لقب سے یاد کیا۔ عدالتوں کا کام ہندی میں ہونے لگا تو انھوں اپنے اسکول کے زمانے کے استاد پنڈت رام بھروسے ترپاٹھی جی کو کئی ہفتے تک بلا کر باقاعدہ ہندی سیکھی۔ وکالت کے آخری دور میں وہ بہرائچ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن (ضلعی انجمن وکلاء) کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔

آزادی کی آمد کے برسوں پہلے سے وہ سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے۔ پاکستان تحریک کے دوران انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کی، آگے چل کر ضلع مسلم لیگ کے صدر بنے اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان جانے والے کچھ سیاستدانوں نے انھیں وہاں اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کی مگر انھوں نے ''جو خدا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے'' کہتے ہوئے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۱ء میں آچاریہ کرپلانی کی کسان مزدور پرجا پارٹی جوائن کی جس نے انھیں آئندہ سال ہونے والے یوپی اسمبلی کے الکشن میں قصبہ نانپارہ سے انھیں اپنا امیدوار بنایا جسکے اعلان کے بعد کانگریس پارٹی نے انکے مقابلے میں وہاں کے راجہ سعادت علی خاں کو میدان میں اتارا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مقامی حکمراں کے خلاف الکشن لڑنا شکست فاش کو دعوت دینا ہے مگر اس خوف سے میدان سے ہٹ جانا انکے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ بعد کے سالوں میں وہ ملّی مفاد میں کانگریس کی حمایت کرنے لگے تھے اور دوسروں کو بھی اسکا مشورہ دیتے تھے۔ ۱۹۵۷ء کے پارلیمانی انتخاب سے قبل انھوں نے ''آنے والے انتخابات مسلمانان ہند کیلئے ایک لمحۂ فکریہ'' کے عنوان سے ایک کتابچہ تصنیف کر کے اپنے ذاتی خرچ پر شائع کروایا تھا۔ تاہم کانگریس کے صوبائی لیڈروں کے بار بار اصرار پر بھی انھوں نے پارٹی جوائن نہیں کی اور سیاست سے کنارہ کش ہو کر باقی عمر وکالت کے ساتھ دینی اور ملّی خدمات میں مصروف رہ کر گزار دی جن میں وہ شروع ہی سے حصّہ لیتے رہے تھے۔

ایک بار مقامی عدالت نے انھیں بہرائچ کی مشہور و معروف درگاہ سید سالار مسعود غازی سے متعلّق ایک مقدمے میں وہاں کا رسیور (ناظم مالیات) مقرّر کیا تھا۔ اس درگاہ میں بعض زائرین جوش عقیدت میں مزار پر سجدہ کرتے تھے جس پر انھوں نے پابندی لگائی تو قبر پرست حضرات عدالت میں اپیل لے کر پہونچے۔ آزادی مذہب کے نام پر فیصلہ اپیل کنندگان کے حق میں ہوا تو انھوں نے مستعفی ہونے کو ترجیح دی۔ برسوں بعد غالبًا ۱۹۵۹ء میں درگاہ کے معالات پر پھر نزاع ہوا تو یوپی سنٹرل بورڈ کے صدر جسٹس نعمت اللہ مرحوم نے انھیں درگاہ کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر کا عہدہ سونپا مگر وہاں ہونے والی رسوم اور انکے ذاتی عقائد کے تضاد نے انھیں اس عہدے پر زیادہ عرصے نہیں رہنے دیا۔

تعلیمی معاملات میں مرحوم شروع ہی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے بہرائچ میں مسعودیہ جناح ہائی اسکول کے قیام میں پیش پیش رہے اور اسکول کے مینیجر کے فرائض انجام دیئے۔ حصول آزادی کے بعد آزاد کالج بنا تو اسکے معاملات میں بھی ہر طرح کی استعانت کی اور بعد میں ایک عرصے تک اسکے بھی مینیجر رہے۔ صوبائی سطح پر وہ یوپی کی دینی تعلیمی کاؤنسل کے بانیوں میں تھے اور شہر بستی میں ہونے والے افتتاحی اجلاس میں مولانا حفظ الرحمٰن اور قاضی عدیل عبّاسی مرحومین کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔

اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ کے مسائل میں بھی والد محترم بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں وہاں ہونے والے ایک بدنما واقعے کے بعد جب حکومت ہند کے بنائے ہوئے ایک نئے قانون اور بعد میں عدالت عظمٰی کی طرف سے اسکی توثیق کے نتیجے میں یونیورسٹی کا اقلّیتی کردار مجروح ہوا تو اسکی بحالی کیلئے شروع ہونے والی تحریک میں پیش پیش رہے اور اس سلسلے میں کئی بار علی گڑھ اور دہلی کا سفر کیا۔ انھیں اسفار میں ایک بار علی گڑھ میں طلباء کی انجمن کی طرف سے یونین ہال میں مسلم پرسنل لا پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں جس میں ہم بھی شریک تھے انھوں نے ایسی زبردست تقریر کی کہ مذاکرات کا نقشہ ہی پلٹ گیا اور مدّتوں تک کیمپس پر اسکی پذیرائی ہوتی رہی۔

علماء دین سے مرحوم کا ہمیشہ ایک دلی تعلّق رہا اور طبقاتی یا سیاسی اختلاف اس پر کبھی غالب نہیں ہوا۔ ہمارے بچپن میں ایک بار مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ بہرائچ تشریف لائے اور بعد مغرب جامع مسجد کے لان میں ایک بڑے جلسے سے خطاب فرمایا۔ نہ جانے کیسی مجبوریوں سے والد ماجد مرحوم اس جلسے میں شرکت تو نہیں کر سکے مگر ہمیں ساتھ لے کر مسجد کی چار دیواری کے باہر کھڑے ہو کر انکی زیارت کی اور کچھ دیر تقریر بھی سنی۔ اپنے مرشد حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے دو بزرگ خلفاء شاہ وصی اللہ اور شاہ عبدالغنی مرحومین سے خط و کتابت رکھتے تھے اور کبھی کبھی سفر کر کے انکی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ حضرت کے ایک تیسرے خلیفہ مجاز صحبت مولوی عبدالولی صاحب مرحوم بہرائچ ہی میں رہتے تھے ان سے ہم لوگوں کے گہرے خاندانی مراسم تھے اور ایک دوسرے کے گھر اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ بہرائچ کے معروف عالم دین صاحب مفتاح القرآن مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم سے بھی انکے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں سیاسی اختلافات کے باوجود علمی اور دینی کاموں میں اکثر شریک کار ہوتے تھے۔ ایک اور بزرگ مولانا حمید الدّین مرحوم جو بعد میں کلکتہ چلے گئے تھے ایک عرصے تک ہمارے وسیع و عریض گھر کے ایک حصّے میں رہتے تھے اور خاندان کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ باہر سے تشریف لانے والے ممتاز علمائے کرام شہر میں قیام کے دوران ہمارے والد مرحوم کے مہمان ہوتے تھے۔ اپنے گھر میں جن مہمانان کرام کو ہم نے بچپن میں دیکھا تھا ان میں حضرات والا تبار مناظر احسن گیلانی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قاری محمّد طیّب، شاہ معین الدین احمد ندوی، آزاد سبحانی اور شاہد فاخری صاحبان رحم الله عليهم اجمعين کا غریب خانے پر قیام کرنا اور ہمارا انکی خدمت پر معمور کیا جانا کرنا ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ بعد کے سالوں میں والد محترم کو مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی اور رائے بریلی کے قریب تکیہ میں مولانا کی مجلسوں میں شریک ہونے جایا کرتے تھے۔ علماء کے طبقے میں انھیں بڑے احترام سے ''سیّد صاحب'' کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

والد محترم نے اپنی عمر کے ہر دور میں زندگی بڑے منظّم طریقے سے گزاری اور شب و روز کے معمول میں کبھی فرق نہیں کیا۔ نہ صرف حالت صحت میں بلکہ بیماری آزاری میں بھی انھیں طلوع آفتاب کے وقت کبھی بھی سوتے نہیں دیکھا گیا، خواہ ساری رات جاگ کر کیوں نہ گزاری ہو۔ غذا ہمیشہ قلیل رہی، جسامت موزوں، اعضاء متناسب اور چہرے سے ٹپکتی ہوئی وجاہت۔ عدالت اور عوامی جلسوں میں ہمیشہ شیروانی پہنتے اور گھر میں سفید کرتا پائجامہ۔ فجر، مغرب اور عشاء کی نمازیں مسجد میں با جماعت ادا کرنے کا معمول زندگی بھر نبھایا، رمضان کے روزے کبھی قضا نہیں کئے اور جون جولائی کی شدید گرمی میں بھی رکھے۔ عہد جوانی میں وہ بعد نماز فجر شہر سے دور دریا کے کنارے ہواخوری کیلئے جایا کرتے تھے۔ کوٹھی کے بیرونی حصّے میں انھوں نے اپنا آفس بنایا ہوا تھا جو قانون کی کتابوں اور مقدمات کی فائیلوں سے بھرا رہتا تھا، صبح کچہری جانے سے پہلے اور شام کو بعد مغرب وہاں کام میں مصروف رہتے۔ اسکے ساتھ ہی وسیع ڈرائینگ روم تھا جہاں آنے جانے والوں سے ملاقات کرتے، اور عصر اور مغرب کے درمیان روزانہ بیرونی صحن میں احباب کے ساتھ نشست ہوتی تھی۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور شہر میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔ خود بہت خوش الحان تھے اور کبھی کبھی گھر کے اندر فارسی اساتذہ کا کلام گنگنایا کرتے تھے جن میں عبدالرحمٰن جامؔی کی نعت ''نسیما جانب بطحا گزر کن، ز احوالم محمد را خبر کن'' انکی سب سے پسندیدہ چیز تھی۔ علاّمہ اقبالؔ کی منقبت برائے جگر گوشۂ رسولؐ بی بی فاطمہ زہرا ''مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز، از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز'' مترنّم آواز میں اکثر گنگناتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں کی تربیت کی خاطر رات میں گھر کے اندرونی صحن میں اکثر بیت بازی کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ گھر میں ریڈیو تھا جس پر صرف مذہبی پروگرام، خبریں اور شعر شاعری سننے کی جازت تھی، فلمی نغمے شجر ممنوعہ کے درجے میں تھے۔

اپنے عقائد میں والد محترم توحید خالص کے قائل اور اس پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ اس عقیدے کو دوسروں کو فہمائش کی نہ صرف بھرپور کوشش کرتے تھے بلکہ اسکی خاطر اپنے پرائے کسی سے بھی خفا بلکہ متنفر ہو جانے میں بھی انھیں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ الحبّ لله و البغض لله کا ورد اکثر انکی زبان پر ہوتا تھا اور وہ عوام سے مولانا حالؔی کی شکایت ''نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں'' کی بیخ کنی کیلئے لفظی طور پر ہر کس و ناکس کے ساتھ شمشیر بزن ہوتے رہتے تھے۔ بدعقیدگی اور گنڈے تعویذ کے سخت خلاف تھے۔ ہمارے بڑے بھائی اختر محمود (متوفی ۱۹۸۶ء) بچپن میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ ایک بار جب سخت علیل تھے ایک ملاّنی قسم کی ملازمہ انکی صحت کیلئے مٹّی کے برتن میں کوئی تعویذ نما چیز تیار کر رہی تھیں۔ والد مرحوم باہر سے آئے تو اسے دیکھ کر سخت ناراض ہوئے اور جوتے کی ٹھوکر سے ہٹا دیا۔ نہ صرف ان معاملات میں بلکہ یوں بھی انکے مزاج میں ذرا سختی تھی اور غصّے اور خفگی کا اکثر

اظہار ہوتا رہتا تھا۔ایک بار پاکستان کے سفر میں ہم نے والدہ مرحومہ کے چھوٹے بھائی پروفیسر سیّد شید اعظیم صاحب مرحوم ومغفور سے والد محترم کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کروانے کی استدعا کی تو انھوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس سے ہمارے والد ماجد کے مزاج کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔اس ریکارڈ کا متن ''حیات محمود'' میں شامل کیا گیا تھا جسے ہم یہاں بھی نقل کررہے ہیں۔

''میرے دل میں جتنی عزت بھائی محمود حسن صاحب کی ہے اتنی کسی بھی دیگر عزیز کیلئے نہیں ہے کیونکہ میں ان میں سے کسی کو انکے پاسنگ بھی نہیں پاتا۔ وہ ہمہ صفت انسان ہیں انکی شگفتہ مزاجی، تقدّس ، مذہبی علم اور سب سے بڑھ کر انکا خلوص اور شفقت اس درجے کے ہیں جسکی مثال نہیں ملتی۔وہ انتہائی ذہین انسان ہیں اور مشکلات میں گھبرانے والے نہیں ہیں۔اپنی مشکلات سے تو انسان کنارہ کشی کرہی نہیں سکتا مگر دوسروں کی مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ان کا یہ شیوہ کبھی نہیں رہا اور جب کبھی کسی کو بھی انھوں نے مشکلات میں گھرا ہوا پایا ہے تو اس سے منہ موڑنے کے بجائے اسکی مشکلات کو سمجھنے اور اسکی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے جو کہ ایک نہایت قابل قدر بات ہے۔ وہ ہر معاملے میں نہایت سچے، صحیح سوچنے والے اور صحیح راستے پر چلنے والے انسان ہیں۔بعض وقت جب وہ کسی کو بھی کوئی بھونڈی بات کہتے سنتے ہیں تو اس پر ناراض بھی ہوتے ہیں لیکن ان کو سمجھنے والے خوب جانتے ہیں کہ ان کی ناراضگی کے اندر کس قدر خلوص مضمر ہے''۔

خاندان بھر کے چھوٹوں بلکہ دوست احباب کے نوجوان اعزّ اء کو بھی والد مرحوم ہمیشہ بڑے دلنشیں انداز میں نصیحتیں کیا کرتے تھے اور زندگی کے نشیب وفراز سے نبرد آزما ہونے کے نسخے بتایا کرتے تھے۔ان نصیحتوں اور فہمائشوں کا کیا انداز ہوتا تھا اسکے کچھ نمونے ہم ذیل میں اپنے نام انکے کچھ مراسلات سے پیش کررہے ہیں۔:

''اللہ تعالیٰ نے تمھیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے، ہزاروں میں تمھیں ممتاز کیا ہے۔انکے انعام واکرام کی تم پر بارشیں ہیں اور انشاءاللہ آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔میں تم کو اور اپنے تمام اعزّ اء واقربا کو نصیحت بلکہ وصیّت کرتا ہوں کہ جیسا کہ اکبرالہٰ آبادی کہہ گئے ہیں'اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو'۔ ہر وقت ذہن میں متحضر رکھنا تم سب ایک ایک فرداً فرداً کہ ہم کیا ہیں، ہمارے حقوق کیا ہیں، ہمیں ہر وقت اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ ہر وقت اسکا استحضار رکھنا چاہیئے کہ ہماری ایک ایک جنبش اور خیال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں اور ہمارے ہر قول اور ہر ارادے پر انکا وہ علم غیب جسکی کوئی تھاہ نہیں ہے وہ سب پر حاوی ہے۔اللہ سے ڈرتے رہو، اسکے حقوق ادا کرتے رہو، تم میں سے ہر ایک انشاءاللہ دنیا میں پھلو گے پھولو گے اور ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں بلکہ بے شمار میں انشاءاللہ ممتاز رہو گے، دین دنیا دونوں تم سب کی بن جائے گی۔'' (مراسلہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۰ء)

****

''میرا ذاتی تجربہ ہے اور بارہا کا آزمودہ ہے کہ جب کبھی غیر معمولی حالات ہوں یا کوئی فتنہ کھڑا ہو تو مومن نہائت دانشمندی اور پورے سکون قلب کے ساتھ خاموشی اختیار کرلے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے تو تو تر کی بہ تر کی جواب دینے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائے بلکہ اپنی طرف سے سلامت روی اور معقولیت کا رویّہ ہی اختیار کئے رہے۔اس سے دل کو تقویت بھی پہونچتی ہے اور آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سارے بادل چھٹ جاتے ہیں۔فتنہ فرو ہوجاتا ہے اور بالآخر جائزہ لینے پر مسرّت ہوتی ہے کہ ابتلاء کا زمانہ سرخروئی سے گزر گیا۔ہم نے خود اپنی طرف سے کوئی زیادتی کسی کے ساتھ نہیں کی ہے اور دوسروں کی زیادتی سے جو تکلیف ہمیں پہونچتی ہے اس سے ہمارے گناہ دھلتے ہیں۔ہر اعتبار سے یہ رویّہ مفید اور عاقبت اندیشی کا رویّہ ہے اور ہمیشہ بہت کامیاب رہتا ہے۔''(مراسلہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۳ء)

ایک عرصے سے والد ماجد مرحوم کو فریضۂ حج کی ادائیگی کی فکر رہتی تھی مگر وکالت میں ہر ممکن احتیاط کرنے کے باوجود اس پیشے کے دینی حلقوں کی نظر میں مجروح ہونے کے سبب بہت تذبذب میں رہتے تھے جبکہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ تھا نہیں، نہ کوئی موروثی زمین جائداد تھی نہ زراعت۔۱۹۶۸ء میں پینسٹھ سال کی عمر ہوتے ہوتے اس فکر اور تذبذب دونوں میں اضافہ ہونے لگا جس کا بخوبی علم ہمیں بھی تھا۔چنانچہ اسی سال ہماری پہلی کتاب دہلی میں شائع ہوئی تو دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ اگر پبلشر نے اسکی کوئی رائلٹی ہمیں دی تو اسے پدر بزرگوار کے سفر حج کے اخراجات کی مد میں شامل کیا جائے گا۔ہمارے اس ارادے نے ان اشعار کا جامہ پہنا تھا:

مرے قلم سے الٰہی کرادے الٰہی تو تکمیل، کسی شفیق نے دیکھا اب ایک خواب بھی ہے
یہ کام اب نہیں مشکل کہ اب تراِبندہ، کتاب خواں ہی نہیں صاحب کتاب بھی ہے

لیکن پھر جلد ہی ہمیں انگلستان سے قانونی تحقیق کیلئے فیلوشپ کی پیش کش موصول ہوئی جسے قبول کرنے کی اجازت کیلئے ہم نے انھیں مراسلہ بھیجا تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ''بسم اللہ کرکے جاؤ اور ضرور جاؤ، مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم ہندوستان کے باہر قدم نکالو گے اور دنیا کو دیکھو گے''۔چنانچہ ہم جلد ہی لندن کے سفر پر روانہ ہوگئے، اور ہمارے پبلیشر صاحب نے ہمارے پورا حق تصنیف ہڑپ لیا۔جب انگلستان سے وطن واپسی کا وقت قریب آگیا تو ہم نے والد محترم کو مطّلع کیا کہ ہمارا ارادہ عمرہ کرتے ہوئے وطن لوٹنے کا تھا۔

موسم حج میں چند ماہ ہی باقی تھے اس لئے ''اگر پدر نتواند پسر تمام کند'' کے مصداق انھوں نے ہمیں تحریر فرمایا کہ ''ممکن ہو تو لندن میں کچھ عرصہ اور رک جاؤ اور الحاج بن کر سرزمین ہند میں واپس آؤ''۔ لیکن ہم دہلی کے اس ادارے سے جس سے ہم ان دنوں منسلک تھے طویل رخصت لے کر انگلستان گئے تھے جس میں اب کسی اضافے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے انکے حکم کی تعمیل نہیں کر سکے۔ پھر وطن واپسی کے دو سال بعد ۱۹۷۳ میں ہمیں بالآخر یہ سعادت مل ہی گئی جب مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کے قائم کردہ ایک نیم سرکاری ادارے انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز نے ہمیں کویت، لبنان اور لیبیا کے علمی سفر پر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حج کا وقت قریب تھا اور ہم ادارے کے ناظمین سے بات کر کے پہلے سعودی عرب پہونچے، حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے اور پھر آگے روانہ ہوئے جس پر والد محترم بے حد مسرور و شاد ماں ہوئے تھے۔

مصلحت خداوندی نے اب والد مرحوم کی سفر حج کی شدید خواہش کی تکمیل کا غیب سے یوں اہتمام فرمایا کہ ۱۹۷۴ میں ہمارے دو چھوٹے بھائیوں قیصر اور ناصر سلّمہما کو سلطنت عمان کے صدر مقام مسقط میں اچھی ملازمتیں مل گئیں، وہ یکے بعد دیگرے وہاں چلے گئے اور انکے زیر اہتمام آئندہ سال کے حج میں والد محترم کی شرکت کی تیّاریاں ہونے لگیں۔ انکی صحت اب بہت خراب ہو چکی تھی مگر زبردست قوّت ارادی اب بھی سلامت تھی۔ چنانچہ وسط ستمبر ۱۹۷۵ میں مسقط تشریف لے گئے اور وہاں ایک عرصہ قیام کے بعد ناصر سلمہ کی معیّت میں سفر حج پر روانہ ہوئے جو دسمبر کے تیسرے ہفتے میں ہونے والا تھا۔ انھیں نہ صرف اندازہ تھا کہ وہاں سے انکی واپسی محال ہو سکتی ہے بلکہ خواہش بھی تھی کہ ایسا ہی ہو اور ان دنوں مولانا محمّد علی جوہرؔ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ''وہ اور ہوں گے جن کو ہے یہ زندگی عزیز، ہم موت ڈھونڈتے ہیں دیار حبیب میں''۔ بہرائچ میں والد مرحوم کے معتمد خاص مدرسہ نورالعلوم کے مدرّس حافظ نعمان بیگ مرحوم کے بیٹے رضوان بیگ نے جوان دنوں مکہّ معظّمہ میں ملازمت کر رہے تھے وہاں ضروری انتظامات کئے اور والد محترم بالآخر اس مقدس فریضے سے فارغ ہوئے۔ مزدلفہ میں کھلے آسمان کے نیچے بحالت احرام شب گزاری نے انھیں نمونیا کے عارضے میں مبتلا کر دیا تھا اس لئے واپس آکر مکہ معظّمہ میں فروکش رہے۔ ابھی مدینہ منورہ روانگی کا دن نہیں آیا تھا کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۷۵ کو بعد نماز فجر وہ خدا کے اس زمینی گھر سے اسکے آسمانی گھر کی طرف چپ چاپ روانہ ہو گئے۔ خانۂ کعبہ میں نماز جنازہ ہوئی اور مکہ معظّمہ کے تاریخی قبرستان جنّت المعلیٰ میں زوجۂ رسولؐ امّ المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے مزار کے قریب سپرد خاک کر دیئے گئے۔ لکھنؤ کے مولانا منظور نعمانی مرحوم بھی اس سال حج میں شریک تھے، اس حادثۂ جانکاہ کی خبر دس دن بعد انکے ذریعے ہندوستان پہونچی تھی۔ 'خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را'۔

ہر قسم کی تعلیم و تربیت کی خاطر والد محترم نور اللہ مرقدہ نے ہمیں اوائل عمر سے ہی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ بہت بچپن میں انھوں نے کلام پاک ہمیں اس طرح پڑھایا کہ اسکی ایک ایک آیت ہماری رگ و پے میں سما گئی۔ اکثر ہم سے قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو فرماتے اور ہماری معروضات سن کر خوش ہوتے۔ ایک بار جبکہ ہماری عمر دس سال سے بھی کم تھی سمجھا رہے تھے کہ آیت کریمہ والسجدو مع الساجدین میں ''سجدے سے مراد ہمیشہ پوری نماز ہوتی ہے اور ہم نے عرض کیا کہ کلام پاک میں وارکعو مع الراکعین بھی تو آیا ہے تو بڑی مسرّت اور شفقت سے اٹھ کے ہمیں چہرے اور پیشانی پر بوسے دیئے۔ بچپن میں انگریزی اور اردو کی اسکولی کتابیں گھر پر سبقاً سبقاً خود پڑھاتے تھے اور علماء کرام سے گفتگو کے دوران اکثر ہمیں ساتھ رکھتے تھے۔ جب ہم بغرض تعلیم لکھنؤ، گورکھپور اور علی گڑھ میں رہے تو برابر خط و کتابت رکھتے اور مراسلت کا یہ سلسلہ لندن میں ہماری اعلیٰ تعلیم کے دوران بھی بدستور جاری رہا۔ اور انکے خطوط عموماً رسمی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت اور پند و نصائح کا ذریعہ ہوا کرتے تھے۔

والد ماجد مرحوم و مغفور کے دنیا سے جانے کے چوتھائی صدی بعد ۲۰۰۱ میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''جرأت رندانہ، نظریات و شخصیات'' میں ہم نے انھیں بڑے ادب و احترام سے مندرجہ ذیل الفاظ میں میں خراج عقیدت پیش کیا تھا:

> ''ہم دل سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے والد ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے اگرچہ انسانی کمزوریوں سے انکے مطلق مبرّا ہونے کا دعویٰ ہمیں نہیں ہے۔ ہمیں انھوں نے دین ودنیا، قرآن و حدیث، مروّت و رواداری، تہذیب و تمدّن، اردو اور فارسی، عربی اور انگریزی، نظم و نثر، قانون و ادب سبھی کچھ سکھایا اور ہنستے بولتے، کھاتے کھیلتے، چلتے پھرتے، ڈانٹتے ڈپٹتے، گرجتے برستے، روٹھتے منتے سکھایا۔ مانجھا سنوارا، کھرچا چمکایا اور مس خام کو کندن بنانے کی کوشش میں ایک عمر گزار دی۔ ہماری زندگی ہی نہیں نظریات و خیالات اور ناچیز علمی کاوشیں سب انھیں کی مرہون منّت ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ فردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائیں''۔ (باب ۱۷، و بالوالدین احساناً، صفحہ ۱۵۵)

****

(۴)

سیرت فرزند ہا از امّہات

ہمارے ننھیالی اجداد کا آبائی تعلّق مغربی یو پی کے ضلع سہارنپور سے تھا۔ یہ ہندوستان کا وہ مقدّس علاقہ ہے جہاں کے دو مختلف قصبات نے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے جیّد اور مشہور زمانہ علمی ہستیوں کو جنم دیا تھا اور جہاں کے ایک تیسرے قصبے دیو بند میں ۱۸۶۶ء میں قائم ہونے والا دارالعلوم اگلے چند ہی برسوں میں برّصغیر کا جامعہ ازہر بن گیا تھا۔ اس ضلعے کا امبیٹھہ نامی ایک چوتھا قصبہ معروف بزرگ حضرت شاہ ابوالمعالی علیہ الرحمۃ کا مدفن ہونے کے باعث صدیوں سے بہ نظر عقیدت واحترام دیکھا جاتا رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وہاں ایک بزرگ سیّد فضل عظیم نامی رہتے تھے جو مذکورہ دونوں فضلاء وقت کے ہمعصر تھے اور جنکا شمار اس خطّے کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔ ان کی متعدّد اولادوں میں سے سیّد احسان عظیم، سیّد مقبول عظیم اور سیّد امیر عظیم صاحبان کے اسماء گرامی معروف ہیں۔ اس خاندان کی اگلی نسل کے کئی ارکان نے میدان ادب اور درس و تدریس میں پورے برّصغیر میں نمایاں مقام حاصل کیا جن میں سب سے ممتاز نام مشہور ومعروف ادیب وقار عظیم اور نعت گو شاعر اقبال عظیم مرحومین کے ہیں۔

سیّد فضل عظیم علیہ الرحمۃ کے خلف اکبر خان بہادر سیّد احسان عظیم صاحب مرحوم ومغفور ہمارے نانا تھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکومت یو پی کے پوسٹ ین اینڈ ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ میں ملازمت شروع کی تھی، بتدریج ترقّی کرتے کرتے صوبے کے ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کے اعلیٰ عہدے تک پہونچے تھے، اور حکومت برطانیہ کی طرف سے ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ اس موقع پر انکے ایک مصاحب خاص بابو مہراج نرائن نے بڑی شستہ اردو میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا ''فضل ایزد سے ملا خان بہادر کا خطاب، مرتبہ اور بڑھائے ترا اللہ کریم''۔ ملازمت سے سبکدوشی سے کئی سال پہلے انھوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ شہر کی مشہور شاہراہ ہیویٹ روڈ پر واقع ایک سرکاری کوٹھی میں رہتے تھے۔ نانی صاحبہ مراد آباد کے ایک مشہور ومعروف خاندان مفتیان سے تعلّق رکھتی تھیں۔ ان بزرگوں کو خالق دو جہاں نے تین بیٹیاں (سیّدات نایاب جہاں، سردار جہاں اور منور جہاں) اور پانچ بیٹے (سیّد سراج العظیم، سیّد اقبال عظیم، سیّد فیروز عظیم، سیّد شیداعظیم اور سیّد سعید العظیم) عطا کئے تھے۔ نانا حضور ملازمت سے سبکدوشی تک ہیویٹ روڈ کی اسی کوٹھی میں مقیم رہے اور ہماری پیدائش اسی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ بعد میں انھوں نے محلّہ گنیش گنج میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملک کی آزادی کے وقت وہیں رہائش پذیر تھے۔ خاندان میں تین اموات (اہلیہ محترمہ، بڑی بیٹی اور منجھلے بیٹے) کے تابڑ توڑ حادثوں نے خاندان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر تقسیم ملک کے بعد بیحد دگرگوں حالات پیدا ہوئے اور ان سب سے دلبرداشتہ ہو کر وہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں جبکہ ہم لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے کراچی میں انتقال فرمایا اور دس سال بعد ہمیں انکی آخری آرامگاہ پر حاضری کا موقع ملا تھا۔ رحمہ اللہ علیہ

نانا حضور کی سب سے چھوٹی بیٹی منور جہاں بیگم عرف منّی بی ہماری والدہ تھیں۔ نانی صاحبہ کے ایک بھائی مفتی محمّد عطا مرحوم ومغفور ضلع بہرائچ کے قصبہ نانپارہ میں سرکاری ملازمت میں تھے اور ہمارے والدین کا رشتہ انھیں نے یہ کہہ کے طے کروایا تھا کہ ''میں نے منّی بی کیلئے ایسا رشتہ ڈھونڈا ہے کہ چراغ تو کیا گیس کا ہنڈا لے کر ڈھونڈا جائے تب بھی نہیں ملے گا''۔ ۴ اگست ۱۹۳۴ء کو لکھنؤ کے مشہور عالم دین مولانا عبدالشکور علیہ الرحمۃ نے نکاح پڑھایا۔ والدہ مرحومہ تعلیمیافتہ تھیں، اردو، فارسی اور انگریزی زبانیں جانتی تھیں اور ایک خوب رو، خوبصورت، خوب سیرت، سنجیدہ اور متین شخصیت کی حامل تھیں۔ ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی اپنی انگریزی خودنوشت میں ہم نے اپنے والدین کی ایک خاص انداز سے تصویر کشی کی تھی جسکی اردو تلخیص ہماری کتاب ''قصۂ درد سناتے ہیں'' مطبوعہ ۲۰۰۹ء میں شامل ہے۔ اسکا ایک اقتباس درد ذیل ہے:

> ہندوستان کی آزادی اور ملک کی اندوہناک تقسیم کا سال شروع ہو چکا ہے۔ بہرائچ شہر میں واقع ایک چھوٹی سی سرمئی رنگ کی کوٹھی کے بیرونی حصّے میں ایک بڑے عالم دین حکیم سیّد احمد حسن کے صاحبزادے لوگوں کو حافظ شیرازی کا معنی خیز شعر'' ابلہاں راہمہ شربت زگلاب وقنداست، قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم'' سنا کر اسکی تشریح کر رہے ہیں۔ کوٹھی کے اندرونی حصّے میں انکی شریک حیات، ایک باپردہ اور باوقار خاتون بچّوں سے گھری ہوئی شیخ سعدی کی گلستاں پڑھاتے ہوئے انھیں ''چہل سال عمر عزیزت گزشت. ہنوز از مزاج تو طفلی نہ گشت'' کا مطلب سمجھا رہی ہیں۔ کوٹھی کے شیروانی پوش اور وجیہ وبارعب مالک سیّد محمود حسن شہر کے ایک ممتاز وکیل، محترم سیاسی رہنما، مسلّمہ سماجی کارکن اور عالم باعمل شخص ہیں اور انکی سادہ سفید ساری میں ملبوس شریک حیات لکھنؤ کے خان بہادر سیّد احسان عظیم صاحب کی بیٹی ہیں۔ یہ دونوں، خدائے پاک دونوں کو غریق رحمت فرمائے، ہمارے والدین تھے اور ہم انھیں کی گودوں کے پروردہ ہیں۔ (باب اوّل، صفحہ ۱۶)

والدہ صاحبہ کی پیدائش کا سال ۱۹۱۴ء تھا اور بیس سال کی عمر میں وہ والد مرحوم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں۔ازدواجی رفاقت کے تقریباً انّیس سال بہ حسن وخوبی گزرے۔اپنے شوہر محترم کے عندیے کے مطابق زندگی بھر پردے میں رہیں اور اپنے خسر کے علاوہ کسی اور سسرالی عزیز کے سامنے بھی نہیں آئیں۔ہم انکی چوتھی اولاد اور تیسرے بیٹے تھے اور ہمارے لئے انکی مادارنہ شفقت کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔علم وادب کے میدانوں میں ہماری طفلانہ دلچسپی دیکھ کر انھوں نے ہماری قدم قدم پر ہمّت افزائی کی اور اصلیت یہ ہے کہ کم عمری میں ان سے ملی ہوئی تربیت ہی نے ہماری آئندہ پوری زندگی کے نقوش مرتب کئے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے والد بزرگوار اور سب بھائیوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد سے وہ انھیں یاد کر کے اکثر اداس ہو جایا کرتی تھیں۔پانچ سال بعد جون ۱۹۵۳ء کی آٹھ تاریخ کو جبکہ رمضان المبارک کا پچیسواں روزہ تھا اور گھر میں عیدالفطر کی تیّاریاں چل رہی تھیں اچانک شدید بیمار پڑ گئیں۔سارے شہر میں جتنی طبّی سہولیات مل سکتی تھیں سب مہیّا کروائی گئیں لیکن مشیّت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔سب دوایں اور دعایں بیکار گئیں اور تیسرے دن ۲۷ رمضان کو شام کے پونے پانچ بجے وہ زندگی کے انتالیسویں سال میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ہم اس وقت نویں کلاس کے طالبعلم تھے اور والد محترم کے حکم سے سرہانے بیٹھے سورہ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ ہماری کمسنی اور طفلانہ معصومیت کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ دزدیدہ نظروں سے انکی سانس اکھڑتے اور پھر سر ایک طرف لڑھکتے دیکھ کر بھی تلاوت بند نہیں کی حتّیٰ کہ والد محترم نے آکر ہمارے ہاتھوں میں کلام پاک یہ کہتے ہوئے بند کر دیا کہ ’’بھیّا آپ کی بی امّی چلی گئیں‘‘۔

والد محترم صاحب نے جس بہادری اور صبر واستقامت سے اس اچانک ہونے والے حادثۂ جانکاہ کا سامنا کیا اسکی مثال ملنا مشکل ہے۔وہ روزے سے تھے لیکن پیاس کے باوجود افطار کے وقت کا انتظار کیا اور پانی سے روزہ کھول کے اعلان کیا کہ تدفین اسی دن شب میں کی جائے گی۔گھر کے باہری صحن میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں جن میں متعدد علماء بھی شامل تھے دنیا سے جانے والی رفیقۂ حیات کی نماز جنازہ انھوں نے خود پڑھائی جس میں جان بوجھ کے تاخیر اس لئے کی شرکت کیلئے آنے والوں کی نماز تراویح قضا نہ ہو۔نصف شب کو جنازہ ایک ہجوم کے ساتھ قبرستان پہونچا۔والد صاحب کے حکم سے چاروں طرف چادر تان کے ہمیں کفن سرکا کے انکا آخری دیدار کرایا گیا اور دادا حضور کی قبر کے برابر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔والدہ مرحومہ کی علالت،وفات اور تجہیز وتکفین کا لمحہ بہ لمحہ ذکر ’’حیات محمود‘‘ کے اصل ایڈیشن میں موجود ہے جس میں ہماری وہ طفلانہ نظم بھی شامل ہے جو ہم نے اس حادثے سے متاثر ہو کر کہی تھی۔بعد میں شائع ہونے والی اپنی متعدّد کتابوں میں بھی ہمیں دنیا میں لانے والی اس عظیم خاتون کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کیفیت یہ ہے کہ ’’اب بھی ہے یہ عالم کہ وہ آجاتی ہیں جب یاد، پہروں تو مزاج دل ناداں نہیں ملتا‘‘۔

اب سے تقریباً تین سال پہلے ہمارے عزیز بھائی خالد محمود نے دنیا کو خیر باد کہا اور بہرائچ میں والدہ کی قبر کے پاس مدفون ہوئے تو اس وقت کی اپنی کیفیت کا ذکر ہم نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں (جو ہمارے بچپن کے دوستوں ساغر مہدی، شاعر جمالی اور اظہار وارثی مرحومین اور خود سے انکی دوستی سے متعلق ہے) اس طرح کیا ہے کہ:

> ’’ہمارا قصّۂ چہار درویش تو ختم ہوا لیکن ہم ابھی حال میں بچھڑنے والے اپنے ایک اور عزیز دوست کا مختصر تذکرہ کرنا چاہیں گے جنھوں نے ہمارے اس قصّۂ پارینہ کا شروع شروع سے آخر تک ہر قدم پر قریبی مشاہدہ کیا تھا۔یہ تھے ہمارے حقیقی بھائی خالد محمود،عمر میں دو سال چھوٹے،تعلّقات میں بھائی کم دوست زیادہ،ہماری ہی طرح شعر وادب کے دلدادہ،اور بہرائچ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہمارے ہم پیالہ وہم نوالہ۔اب سے کئی سال پہلے انسان کو اندر سے آہستہ آہستہ گھلا کے رکھ دینے والے ایک موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور کئی سال تک سخت جسمانی ودماغی تکلیف جھیل کر بالآخر ۷ دسمبر ۲۰۱۸ء کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں زندگی کی جنگ ہار ہی گئے۔ہم سنگاپور کے سفر پر تھے،حالت نازک ہونے کی خبر پا کر بھاگم بھاگ دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ پہونچے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔جسد خاکی کو تدفین کیلئے بہرائچ لے جایا گیا اور والدہ مرحومہ کے جوار میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔قبرستان میں ہماری آنکھوں میں پینسٹھ سال پہلے کا وہ المناک منظر گھوم گیا جب ہم نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے ٹھیک اسی جگہ اپنی جان چھڑکنے والی ماں کی قبر پر مٹّی ڈالی تھی۔دل کی دھڑکن کی رفتار خطرناک حد تک بڑھی ہونے کی کیفیت میں ہم نے اب ایک زندگی بھر کی برادرانہ اور دوستانہ رفاقت کو بھی وہیں زمین کی گہری تہوں میں گم ہوتے دیکھا اور جناب منوّر رانا کا یہ مبنی بر حقیقت شعر دل ہی دل میں دہراتے رہے کہ ’’ہم کو معلوم ہے شہرت کی بلندی ہم نے، قبر کی مٹّی کا دیکھا ہے برابر ہونا‘‘۔ (سہ ماہی امکان،لکھنؤ ۲۰۱۹ء)

****

(۵)
قرآن کریم کی بیسک ریڈر

ہمارے والد ماجد مرحوم ومغفور کو یہ فکر ہمیشہ ہی رہتی تھی کہ غیر عربی داں لوگ بھی قرآن کریم کے الفاظ کو صحیح تلفّظ اور عربی حروف کے صحیح مخارج سے پڑھ سکیں۔ بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے اس غرض سے ۱۹۷۰ کے آس پاس ''قرآن کیسے پڑھیں'' کے عنوان سے ایک مفصّل مضمون لکھنا شروع کیا۔ عربی زبان پر قدرت اور قانونی ذہن نے ساتھ دیا اور ایسے نادر فارمولے مرتّب ہونے لگے جنکے ذریعے لوگ عربی کا ایک حرف جانے بغیر اللہ کے کلام کو عربی داں قارئین کی طرح پڑھ سکیں۔ کام آگے بڑھا تو انھوں نے اسے مکمّل کتاب کی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ کتاب کا عنوان ''قرآن کریم کی بیسک ریڈر'' رکھا اور اسکے نیچے ذیلی عنوان ''رہنمائے تلاوت'' تحریر کیا۔ کتاب کو متعدّد اسباق میں تقسیم کیا اور ہر سبق کے تحت نادر قواعد وضع کئے۔ کتاب کے ہر صفحے پر عربی اور اردو کے الفاظ کو انکا صحیح تلفظ سمجھانے کیلئے قوسین میں انگریزی اور ہندی رسم الخط میں بھی لکھا۔ کتاب کے شروع میں ایک مفصّل دیباچہ لکھا جس سے کچھ متفرق جملے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

> ''ہندوستان کے ہر حصّے کی زبان ایک نہیں ہے۔ کہیں کہیں ایک علاقے میں رہنے والا دوسرے علاقے کی زبان بالکل نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اللہ کے کلام کو جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے صحیح طور سے سمجھنے کیلئے ہر علاقائی زبان میں اس نئے علم وفن پر کتابیں لکھی جاتیں مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ کم از کم مصنّف کے علم میں ایسی کوئی بیسک ریڈر نہیں ہے جو قرآن مجید صحیح طور پر پڑھنے اور پڑھانے کی سب ضروری باتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو۔ اور ہماری غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان میں کلام پاک کی تلاوت کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد، غالبًا نوّے فیصدی کے قریب، قرآن کے حرفوں کی عربی آواز اور طرز ادا کو طاق پر رکھ کر اردو حرفوں اور طرز ادا سے تلاوت کرتی ہے۔ اگرچہ ایسا ناواقفیت کی وجہ سے اور بلا ارادہ ہو رہا ہے لیکن بہرحال بڑی سنگین بات ہے۔ یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ایسی سادہ زبان میں تیّار کی گئی ہے جسکو معمولی پڑھے لکھے بچّے، جوان بوڑھے اور ہندی ذریعۂ تعلیم کے پڑھے ہوئے انگریزی داں نوجوان اور موجودہ طالبعلم سب ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔''

دیباچے کے تحت ''دل کی پکار'' کے ذیلی عنوان کے سے لکھا ہے کہ ''عام حافظ صاحبان، مسجد کے عام اماموں اور ناظرہ پڑھنے والے عام مسلمانوں سے درخواست ہے کہ وہ سب اس کتاب کو غور اور توجّہ کے ساتھ خوب سمجھ کر پڑھ لیں اور اس میں لکھی ہوئی باتوں پر خود عمل کر کے اپنی اپنی تلاوت قرآن کی غلطیاں درست کر لیں۔''

اپنی نادر تصنیف کے پہلے سبق کا عنوان فاضل مصنف نے ''قرآن کا تعارف'' رکھا جسکے ایک ایک لفظ سے قرآن پاک کی حقّانیت میں انکی راسخ العقیدگی کا عکس جھلکتا ہے۔ اس سبق کے کچھ متفرق جملے درج ذیل ہیں :

> ''قرآن کریم اللہ تعالٰی کا کلام ہے۔ اللہ تعالی کی دوسری صفات کی طرح ایک صفت یہ بھی ہے اور صفات الٰہی ذات الٰہی کی طرح غیر فانی اور ابدی ہیں۔ اس لئے کلام اللہ بھی غیر فانی اور ابدی ہے، ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ یہ مخلوق نہیں ہے، قرآن کو مخلوق سمجھنا سخت گناہ ہے۔ مشیّت الٰہی کو جب منظور ہوا تو اللہ تعالی نے اپنے ازلی اور ابدی کلام کو لوح محفوظ میں حروف والفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ رمضان کی شب قدر میں اپنے ازلی کلام یعنی قرآن پاک کو آسمان دنیا پر اتار دیا اور اپنی مشیّت وحکمت کے مطابق اسی کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال میں اپنے مقرّب وامین فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السّلام کے ذریعے حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلب مبارک پر نازل فرمایا۔''

فاضل مصنّف نے کتاب کا دیباچہ جون ۱۹۷۳ میں تحریر کیا تھا۔ چند ماہ بعد سفر حج پر روانہ ہوئے تو مسودے کو مزید نوک پلک درست کرنے کیلئے ساتھ لے گئے جہاں وہ اسے لکھنؤ کے مولانا محمّد منظور نعمانی مرحوم کو دکھانا چاہتے تھے جو اس سال حج میں شریک تھے۔ لیکن موصوف کی مصروفیات اور والد محترم کی علالت کے باعث دونوں کی ملاقات نہیں ہو سکی حتیٰ کہ فاضل مصنف نے وہیں داعی اجل کو بھی لبّیک کہہ دیا۔ انکی وفات کے بعد یہ مسودہ ہمارے مسقط میں مقیم بھائیوں کے پاس محفوظ رہا۔ چار سال بعد برادرم قیصر محمود سلمہ اللہ تعالٰی نے اسے مولانا کے پاس لکھنؤ بھیجا جنھوں نے اس کیلئے ایک مفصّل پیش لفظ تحریر فرمایا۔ ذیل میں ہم اس پیش لفظ کے کچھ متفرق جملے درج کر رہے ہیں۔

> ''یہ کتاب، قرآن پاک کی بیسک ریڈر یا رہنمائے تلاوت، جو آپ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ اس کے دیباچے سے آپ کو معلوم ہوگا کے مصنّف مولوی سیّد محمود حسن مرحوم یوپی کے مشہور شہر بہرائچ کے رہنے والے تھے، وکالت انکا پیشہ تھا اور جیسا کہ سنا تھا اس میں بھی وہ بہت ممتاز اور کامیاب تھے۔ ظاہر ہے کہ انکی اصل تعلیم کالج اور یونیورسٹی کی ہی رہی ہوگی لیکن اللہ نے انکی فطرت میں دین سے گہرا تعلّق اور شغف بھی ودیعت کر رکھا تھا۔ دین وملّت کا درد تو ہمارے اس طبقے میں بہت سوں کو نصیب ہوتا ہے لیکن دین کو جاننے اور اس پر عمل کرنے کی فکر شاذ و نادر ہی دیکھی گئی ہے۔ مرحوم انھیں مستثنیات میں سے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیّد صاحب مرحوم نے مجھ سے کبھی اپنی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا بلکہ

اب تو مجھے انکے اس کمال اورظرف کی اس بلندی پر حیرت ہوتی ہے کہ قریباً ۳۰۔۳۵ سال کی طویل مدّت کی پچاسوں ملاقاتوں میں انکی کسی بات سے مجھے شبہ بھی نہیں ہوا کہ ان کوقرآن مجید سے کسی خاص درجے کا لگاؤ اورفنِ قرأت وتجوید سے بھی دلچسپی اور واقفیت ہے۔ اب اس کتاب کے مطالعے ہی سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک سے انکوغیر معمولی شغف تھااورفنِ تجوید سے وہ صرف واقف ہی نہیں بلکہ اسکے ماہر استاد تھے۔اس کے ساتھ کتاب ہی سے معلوم ہوا کہ انکے دل کی یہ خاص لگن اورتڑپ تھی کہ مسلمانوں میں قرآن پاک کی تلاوت صحیح طور پر کرنے کی ضرورت کا عام احساس ہوجائے اوراس کیلئے قواعدِ تجویداورقرآنی الفاظ کے مخارج اورصفات وخصوصیات کے بارے میں ہر تلاوت کرنے والا اتنی واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھے۔یہ کتاب انکی اسی لگن کا نتیجہ ہے۔میں نے کتاب کا مطالعہ اصلاح کے ارادے سے نہیں بلکہ استفادے کی نیّت کیا اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس مطالعے سے بہت فائدہ ہوا۔تلاوت کے سلسلے کی خود اپنی بعض غلطیوں پر مطّلع ہوا اوراصلاح وتصحیح کی توفیق ملی۔''

مولانا نے یہ پیش لفظ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ کو تحریر فرمایا تھا مگر پھر بعض وجوہات سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہوئی، بالآخر جولائی ۱۹۸۲ میں لکھنؤ کے مکتبہ الفرقان کے زیر اہتمام شائع ہوئی اوراس طرح فاضل مصنّف کی یہ مقدّس کاوش انکی وفات کے ساڑھے چھ سال بعد منظرِ عام پر آئی۔کچھ عرصے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ نے بہرائچ میں منعقدہ ایک جلسے میں ۱۶۸ صفحات پر مشتمل کتاب کی باقاعدہ رونمائی فرمائی۔بعد کے برسوں میں ہمارے برادرِ خورد ظفر محمود سلمہ اللہ تعالیٰ کے زیرِ انتظام کئی بار پھر شائع ہوئی اور انھوں نے اردو نہ جاننے والوں کیلئے اسے ہندی رسم الخط میں بھی طبع کروایا۔

۱۹۹۱ میں ہم لندن کے ایک ادارے مسلم اسکول ٹرسٹ کیلئے انکی آنے والی ''انسائیکلوپیڈیا آف سیرت'' کیلئے مضامین لکھ رہے تھے۔اس سلسلے میں کچھ عرصے بعد لندن کا سفر کیا تو وہاں ''قرآن کریم کی بیدک ریڈر'' کے کچھ نسخے اس ادارے کی لائبریری کو تحفتاً پیش کئے۔ادارے کے منتظمین نے ہمیں اس کا انگریزی ترجمہ تیار کرنے کی ترغیب دی اوراسے شائع کرنے کی پیشکش بھی کی۔وطن لوٹ کر ہم نے ترجمے پر کام شروع کیا اور چند ماہ میں نصف کے قریب تیار بھی کرلیا لیکن پھر کچھ نامساعد حالات کے باعث کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ایک دہائی بعد ۲۰۰۱ میں ہم نے اپنے طور پر اس کام کو ازسرِنو پھر شروع کیا اوراسی سال ۱۸ دسمبر کو جو والد مرحوم کی برسی کا دن تھا ترجمہ مکمّل کرکے اس کیلئے لکھے گئے اپنے پیش لفظ پر دستخط کئے۔چند روز بعد حکومت سعودی عرب کی طرف سے مارچ میں ہونے والے حج بیت اللہ میں شرکت کا دعوت نامہ آیا تو اسکی اشاعت کو موخر کرکے والد محترم کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے مسودہ اپنے ساتھ لے گئے تاکہ مقدّس سرزمین میں اس پر نظرِ ثانی کرلیں۔بالآخر وسط ۲۰۰۲ میں یہ کتاب ''بیسک ریڈر آف دی ہولی قرآن'' کے عنوان سے دہلی میں مولانا وحید الدین خاں مدظلہ العالی کے صاحبزادے ثانی اثنین خاں صاحب کے مرکزِ اشاعت گڈ ورڈ پبلیکیشنز سے شائع ہوئی۔اس میں فاضل مصنّف کے دیباچے، مولانا منظور نعمانی مرحوم کے پیش لفظ اور ''قرآن کا تعارف'' والے کتاب کے پہلے سبق کے تو مکمّل ترجمے شامل ہیں، باقی اسباق اورانکے تحت درج تمام قواعد کی انگریزی زبان و محاورے کے مطابق تلخیص کی گئی ہے۔ترجمے کے شروع میں ہمارا تفصیلی پیش لفظ ہے جس کے آخر میں ہم نے عرض کیا ہے کہ :

> ''ایسی تکنیکی کتاب کو جوکہ اصلاً اردو داں قارئین کے لکھی گئی تھی انگریزی میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ضرورت لفظی ترجمے کی نہیں بلکہ اسے عام فہم انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالنے کی تھی۔ہم نے کتاب کے اس انگریزی ایڈیشن کو اردو نہ سمجھنے والے انگریزی داں قارئین کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔''

پیش لفظ کے آخری پیراگراف میں ہم نے واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ ''ہم نے یہ کام فی سبیل اللہ کیا ہے اورہمیں قرآن پاک کی اس عاجزانہ خدمت کے لئے کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں درکار نہیں ہے۔''

تجویدِ قرآن کے فن پر والد مرحوم کی نادر اردو کتاب کا ہمارا تیار کردہ یہ انگریزی ترجمہ ۲۰۰۲ میں اسکی پہلی طباعت کے بعد بار بار شائع ہوا ہے اورآج بفضلِ خداوندی دنیا کے گوشے گوشے میں دستیاب ہے اوردینی تعلیم کے اداروں میں مستعمل بھی ہے۔

****

(۶)

وصیّت بنام ملّت اسلامیہ ہند

۱۹۷۷ میں جب ہم ''حیات محمود'' لکھ رہے تھے ہمیں والد محترم کے ہاتھ سے پنسل سے لکھی ہوئی انکی ایک تحریر دستیاب ہوئی تھی جو مکہ معظّمہ میں انکی وفات کے بعد انکے سامان سفر میں ملی تھی۔ تحریر پر اسکا عنوان ''وصیّت برائے ملّت اسلامیہ ہند'' جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے شروع میں فاضل مصنّف نے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا تھا اور پھر چاروں کو الگ الگ مخاطب کیا تھا۔ تحریر میں پہلے دو طبقات سے خطاب تو مکمّل تھا لیکن تیسرے طبقے سے خطاب کی صرف چند سطریں تھیں، اور چوتھے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ غالباً انھوں نے یہ تحریر دوران سفر لکھنی شروع کی ہوگی جسے وہ مکمّل نہیں کر سکے۔ ہم نے بڑی عرق ریزی سے اس نامکمّل تحریر کے ایک ایک لفظ کو پڑھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے ایک باقاعدہ دستاویز کی شکل دے کر ''حیات محمود'' میں شامل کر لیا تھا۔ ان کی کتاب ''قرآن کریم کی بیسک ریڈر'' تو مطبوعہ ہے لیکن یہ بیش قیمت دستاویز صرف ''حیات محمود'' ہی میں شامل ہے اور اصل دستاویز بھی اب موجود نہیں ہے، اس لئے ہم اسے اس کتابچے میں بھی شامل کر رہے ہیں۔

چہار طبقات

''عزیزان ملّت! آپ میں کچھ ایسے ہیں جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور اس حیثیت سے میرے بڑے بھائی ہیں۔ باقی کچھ تو عمر کے اعتبار سے میرے چھوٹے بھائی ہیں اور بڑی تعداد انکی ہے جو اپنی عمروں کے لحاظ سے میرے بچّے ہیں۔ مگر اس وصیّت کی غرض سے میں ہندوستان کے سب مسلمانوں کو چار طبقات میں تقسیم کر رہا ہوں۔ طبقہ اوّل اس گروہ پر مشتمل ہے جس نے باضابطہ طور پر دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے یا کر رہا ہے۔ اس طبقے میں علماء امّت، مدارس دینیہ کے اساتذہ اور طلباء سب ہی شامل ہیں۔ طبقۂ دووم میں وہ سب بھائی آتے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی، اردو اور فارسی میں تعلیم پائی ہے۔ اس طبقے میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر و دیگر اساتذہ، کالجوں اور اسکولوں کے دیگر اساتذہ، سرکاری و نیم سرکاری عہدیداران اور ماتحت ملازمین، وکلاء ڈاکٹر انجینیر اوورسیر وغیرہ اور ۱۹۴۷ سے پہلے کے وہ انگریزی تعلیمیافتہ شامل ہیں جو تجارت وصنعت زراعت وغیرہ میں مشغول ہیں۔ طبقۂ سوم ان نوجوانوں کا ہے جنھوں نے آزادئ وطن یعنی ۱۹۴۷ کے بعد سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں میں ہندی ذریعۂ تعلیم کے ذریعے پڑھائی کی ہے۔ طبقۂ چہارم ان بے شمار مسلمانوں کا ہے جو یا تو بالکل ان پڑھ ہیں یا بہت ہی کم پڑھے لکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ امّت محمّد یہ علیٰ صاحبا الصلوٰۃ والسلام کے ایک نہایت گنہگار مگر بہی خوار وغمخوار فرد کی حیثیت سے مجھ پر فرض ہے اور میرا حق بھی ہے کہ عمر کی اس منزل پر اپنے دل کا درد چاروں طبقات کے سامنے رکھ دوں۔ معروضات کی تفصیل سے پہلے یہ عرض ہے کہ ذیل کی سطروں میں دل کی بے ساختہ آواز بھری ہوئی ہے۔ مداہنت ہوگی اگر اس آواز کو بے جا تکلفات کا جامہ پہنا کر اصل آواز چھپائی جائے۔ اس لئے اگر کسی جگہ پر نوک قلم سے کوئی ایسی عبارت نکل جائے جسے مخاطب طبقات کے افراد بے ادبی پر محمول کریں تو میں اپنے اخلاص کا واسطہ دے کر نا گواری محسوس کرنے والے مخاطبین سے دست بستہ اور پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

....

طبقہ اوّل سے خطاب

عزیزان گرامی! آپ سب کو علوم دینیہ کا سر چشمہ کلام الٰہی کی باضابطہ تحصیل میں اپنی عمر عزیز کا گرانقدر حصّہ صرف کر دینے کا فخر حاصل ہے۔ آپ ہی حضرات کے گروہ کو ہر زمانے میں نیابت رسول ﷺ کا منصب جلیلہ تفویض رہا ہے اور رہے گا۔ آپ سے بہتر اور کون جانتا ہے کہ تمام علوم دینیہ کا سر چشمہ کلام الٰہی ہے اور ذکر الٰہی میں تلاوت قرآن کا مقام، خواہ وہ نماز میں ہو یا بیرون نماز، بہر حال بہت بلند ہے۔ حتیٰ کہ نماز میں سورۂ فاتحہ حنفی مسلک میں واجب اور شافعی تحقیق کی رو سے فرض ہے۔ صحت تلاوت کا اہتمام والتزام غیر علماء کے مقابلے میں آپ حضرات کیلئے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ جنکے رتبے ہیں سوا انکو سوا مشکل ہے۔ مگر ملک کے مختلف حصّوں میں میرا مشاہدہ بارہا اس افسوسناک منظر پر ششدر رہ گیا ہے کہ آپ کی جماعت میں بھی بہ کثرت حضرات حروف کے مخارج وصفات کے طرز ادا وغیرہ سے مستغنیٰ ہیں۔ فواویلاہ۔

بہ پیچ بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد
زنند لشکریاں بش ہزار مرغ بہ سیخ

برادرادرانِ محترم! آپ حضرات وراثت ہندی کے بلند منصب کے حامل اور امین ہیں اور اس نقطۂ نظر سے آپ ہی حضرات کی جماعت ہر دور میں ملّت اسلامیہ کا قلب رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی آپ ہی حضرات مجموعی طور پر ملّت اسلامیہ ہند کے قلب وجگر ہیں۔ آپکی تھوڑی سی توجّہ اور کاوش موجودہ خامیوں کو جلد دور کر دے گی۔ یقین فرمایئے کہ ذاتی اصلاح پر آپکی یہ محنت اور دلچسپی عوام کی اصلاح کے باب میں بیحد مفید اور نہایت درجہ اثر انداز ہوگی۔ عوام کا موجودہ طرزِ تلاوت بیحد ناقص اور حد درجہ قابل اصلاح ہے۔ ملّت کی رہنمائی آپ کے ذمّے بدرجۂ اولیٰ ہے۔ اس لحاظ سے بھی آپکی تلاوت عوام الناس کیلئے مشعل راہ ہونی چاہئیے۔ بے ادبی نہ ہو تو عرض کروں کہ ان فرائض کی انجام دہی میں لغزش اور کوتاہی پر آپکے منصب کے پیش نظر آپ حضرات کی یقیناً گرفت بھی ہوگی۔ بڑی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے ساتھ قبول مشورہ کی درخواست پیش ہے۔''

....

طبقۂ دوم سے خطاب

''آپ نے سالہا سال کی محنت اور مشقت کے بعد اور اپنے سرپرستوں کا کثیر سرمایہ صرف کرکے علوم وفنون دنیوی حاصل کئے ہیں۔ میں بھی آپ ہی کے طبقے کا ایک فرد ہوں۔ دنیوی زندگی کی عمر اگر سو سال بھی فرض کرلی جائے تو گویا صد سالہ زندگی کی فلاح وبہبود کیلئے ہم آپ نے سالہا سال محنت اور جدّ وجہد کی ہے اور ہم میں سے بہتوں نے اپنی دنیا بنانے کیلئے مختلف علوم وفنون سیکھنے میں بیس پچیّس سال لگا دیئے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد قیامت تک ہمیں عالم برزخ میں رہنا ہے اسکے بعد اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ زندہ کریں گے اور قیامت کا وہ ہولناک دن آئے گا جسکا حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ نے تفصیل کے ساتھ ہمیں بتایا ہے۔ میرے عزیزو! دنیا کی مختصر سی زندگی کے راحت وآرام کی خاطر تو ہم نے سالہا سال صرف کر دیئے مگر آنکھیں بند ہونے کے بعد جو زندگی عالم برزخ سے شروع ہوکر قیامت کے دن سے گزرتی ہوئی ابدالآباد تک قائم ودائم رہنے والی ہے اس میں راحت وآرام پانے کیلئے ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ہم دنیا میں ایسے منہمک رہے کہ آخرت کی خبر ہی نہ لی۔ عزیزو! ابھی وقت ہے اور توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آپ سب صدق دل سے توبہ کرکے اپنے چھوٹے بڑے گناہ اس رحمٰن ورحیم سے معاف کروالیں جو بیحد غفار وتوّاب ہے اور آئندہ کیلئے عہد کرلیں کہ اپنے مقدور بھر ہم اب اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے اور گناہوں سے بچتے رہیں گے۔ یاد رکھئے عبادات میں تلاوت قرآن کی بڑی فضیلت ہے، آپ سب کو اپنی تلاوت کی اصلاح کرنی چاہئیے۔ قرآنی حروف ومخارج اور صفات وحرکات کو بخوبی ذہن نشین کر لیجئے۔ دوسروں کو بھی صحت تلاوت کی فکر کرنے کی ترغیب دے کر اپنا فرض پورا کیجئے۔ مادّہ پرستی کے موجودہ دور میں جبکہ اسلام اور شعائر اسلام کی وہ قدر ومنزلت عوام کے دلوں میں باقی نہیں رہی ہے جو پہلے تھی، جبکہ عوام صرف دولت اور وجاہت دنیوی کو مطلوب حقیقی سمجھنے لگے ہیں، آپ حضرات علماء کے مقابلے میں عوام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپکی شرعی، تبلیغی اور اصلاحی ذمّے داریاں اب بہت زیادہ ہیں۔ ان ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کیجئے۔''

''حیات محمود'' کے اصل ایڈیشن میں ہم نے مصنّف کی اس وصیّت عام کے کئی جملوں اور عبارات پر اپنے وضاحتی نوٹ بھی لگائے تھے اور اس میں شامل احادیث کے حوالے بھی دئے تھے مگر انھیں ہم یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔ بس اسکے متن کے بعد آخر میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ ایک بار پھر کچھ تبدیلی کے ساتھ یہاں مزید عرض کرنا چاہیں گے۔

اس نامکمّل وصیّت میں مضمر اسباق ایک ایسے شخص کی تمام زندگی کے مشاہدات، تجربات اور خیالات کا نچوڑ ہیں جو دنیا والوں میں رہ کر بھی عالم باعمل تھا، جو دینداری کا پیکر تھا، دین جسکا شیفتہ تھا اور جو دین پر فریفتہ تھا اور جس نے اپنے قول وعمل سے اس بات کی پوری تیّاری کر رکھی تھی کہ دوسری دنیا میں پہونچنے پر فرشتے اسے مولانا محمد علی جوہرؔ کے الفاظ میں یہ کہہ کے خوش آمدید کہیں گے کہ :

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

****

(۷)

خراج ہائے عقیدت

جب ہم نے ''حیات محمودؔ'' لکھنے کا ارہ کیا تھا تو ان متعدّد بزرگوں اور دیگر حضرات سے جن سے والدِ محترم قربت رکھتے تھے درخواست کی تھی کہ وہ انکے بارے میں اپنے تأثرات مختصراً تحریر کر کے ہمیں ارسال کریں جنھیں ہم اس کتاب میں شامل کریں گے۔ چنانچہ بہت سے جوابات موصول ہوئے اور ہم نے ان سبھی کو اس میں شامل کیا تھا۔ اسکے علاوہ اردو کے اخبارات ورسائل نے انکے حادثۂ وفات پر جو شذرے اور اداریئے شائع کئے تھے انھیں بھی شامل کیا گیا تھا۔ ان میں سے اہم حضرات کے خطوط وغیرہ کو جو انکے افکار و کردار کا آئینہ ہیں ہم یہاں بھی نقل کر رہے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی :

''سیّد صاحب مرحوم کی محبت اور عنایت کا تقاضہ تھا کہ انکے متعلّق جو کچھ لکھا جائے اطمینان اور دلجمعی سے لکھا جائے لیکن میں اس وقت ایک طویل بیرونی سفر کیلئے پابہ رکاب بیٹھا ہوں اس لئے اسکا موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ وہ صرف وکلاء اور قانون دانوں یا جدید تعلیمیافتہ لوگوں کے طبقے ہی میں نہیں بلکہ قومی وملّی کارکنوں اور رہنماؤں کے گروہ میں بھی اپنی متعدد خصوصیات کی بنا پر امتیاز رکھتے تھے۔ وہ عربی زبان اور علم دین سے بہرہ ور تھے۔ عقیدے کے پختہ، فکرو ذہن اسلامی، طبیعت سلیم اور دینی حمیّت وقومی وملّی عزت سے معمور، ذہن رساں اور نکتہ شناس۔ عمر کے ساتھ ساتھ طبقۂ علماء سے انکا شغف بڑھتا جا تا تھا۔ اصلاح حال اور ترقی باطنی کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ عرصے سے حج کی تمنا تھی، بالآخر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ انھوں نے حج کیا۔ انکی اس خوش نصیبی پر بڑے بڑوں کو رشک آیا کہ اللہ نے انکو مکّہ معظّمہ کے راستے اپنے یہاں بلا لیا۔ جنّت المعلیٰ میں انھیں جگہ ملی جو دنیا کے لحاظ سے مقام محمود ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ انکے درجات آخرت میں بھی بلند فرمائے گا''

مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی :

''سیّد صاحب کی خدمت میں تقریباً چالیس سال سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ ۱۹۳۸ میں پہلی بار انکے مکان پر حاضر ہوا تھا اور چند دن سیّد صاحب کی عنایت سے وہیں قیام کیا تھا۔ سیّد صاحب یہاں بھی بڑے آدمیوں میں تھے، اب انکا شمار وہاں کے بڑے آدمیوں میں ہوگا۔ پاکی وصفائی انکی خصوصیت تھی، اب وہ اپنے مالک کے سامنے بھی پاکی وصفائی سے حاضر ہوئے۔ اسکے گھر کی حاضری کے بعد ہر بندہ پاک وصاف بنا دیا جا تا ہے۔ ہمارے سیّد صاحب تو اللہ کے نیک بندوں تھے۔ اہتمام ملاحظہ کیجئے کہ اپنے گھر ہی سے اپنے پاس بھی بلا لیا گیا۔ قابل صد رشک ہے یہ موت۔ ہماری دنیا میں نہ وہ واپس تشریف لائے نہ ہماری برائیاں انکے قریب پہونچیں۔ اب وہ اللہ کے پاس ہیں اور نیک بندوں میں انکے لئے جگہ بنادی گئی ہے''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی :

''جناب سیّد محمود حسن وکیل سے یوپی کی مسلم پبلک خوب واقف ہے، خصوصاً اودھ کی دینی تعلیمی کانگرنس کے سلسلے میں انکی سرگرمیوں سے۔ اس سال حج کو گئے اور ۱۴ ذی الحج کو ارکان ونوافل اور مستحبّات سب ختم کر چکے تھے کہ داعیٔ اجل کو لبیّک کہہ دیا۔ انّا الیہ و انّا الیہ راجعون۔ حج مقبول کے بعد حاجی تو طفل نوزائیدہ کے مانند ہو جا تا ہے۔ مرحوم ہر طرح دھل دھلا کے جنّت نشین ہو گئے''۔ (صدق جدید، لکھنؤ)

ندائے ملّت، لکھنؤ

''مرحوم نہ صرف ایک کامیاب وکیل تھے بلکہ وقت کی تمام قومی وملّی تحریکوں میں سرگرم حصّہ لیتے تھے۔ گہرا دینی ذوق اور درد رکھتے تھے۔ دینی تعلیمی کاؤنسل کے بانیوں میں سے تھے اور اسکے کاموں میں برابر شریک رہتے تھے۔ اردو زبان کے تحفّظ اور بقا کی کوششوں میں بھی نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ زندگی بڑی دینداری کی تھی اور حسن و اخلاق کے لحاظ سے بے حد ممتاز تھے۔ دینی کتب، خصوصا قرآن مجید کی تفاسیر، کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور عربی زبان سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے یہ تمنّا ظاہر کی تھی کہ انھیں حج مبرور نصیب ہو اور مقدّس سرزمین میں دفن ہونے کی سعادت بھی ملے۔ اللہ نے انکی تمنّا پوری کی اور اس حال اور اس مقام میں دنیا سے اٹھائے گئے کہ انکی مغفرت کسی کو ادنیٰ اشتباہ بھی نہیں ہو سکتا۔''

محمودالحسن ندوی :

''انکی عظمت اور بزرگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ باوجود علم وعمل کے اس حسین امتزاج کے جو انکی پرکشش شخصیت کا جزو لاینفک بن گیا تھا وہ ہر طرح کے علمی و دینی مسائل میں اپنے خوردوں سے بلا جھجک مشورہ کرتے تھے اور انکی رائے معلوم کر کے خوش ہوتے تھے۔ اپنی رائے پر جو یقیناً گہرے تدبّر اور دقیق مطالعے اور تجربے کا نتیجہ ہوتی بحث وتمحیص کا پورا پورا موقع عنایت فرماتے تھے۔ ان کے شب وروز امّت کی فلاح وبہبود اور اپنے رب کی تکبیر وتمجید میں گزرتے تھے۔ انھیں کعبہ اور ربِّ کعبہ سے اس قدر شیفتگی تھی کہ پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کے باوجود حج وزیارت کا قصد کیا اور بالآخر منزل مقصود پر پہونچ کر ہی دم لیا۔ کعبے کی زیارت کی اور بس ربِّ کعبہ سے جا ملے، یعنی زندگی میں جس نظم وترتیب کے عادی تھے اسے وہاں بھی نبھایا۔ اب اسے دیار حرم کی کشش کہئے یا خود انکے خمیر کی مقناطیسیت کہ 'پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'۔ ذات نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے انھیں والہانہ عقیدت تھی لیکن اس عقیدت میں ادب واحترام کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مدینہ طیبہ میں جہاں کائنات انسانی کا محسن اعظم فروکش ہے اسے یقیناً وہ اپنی آخری آرامگاہ بنانا باعث سعادت سمجھتے ہونگے لیکن ذات اقدس کے حضور آرام واستراحت کے تصور کو بھی انھوں نے سوئے ادب خیال کیا اور اسی لئے مکہ معظّمہ کو ہی اپنا مسکن ابدی بنالیا کیونکہ 'باخدا دیوانہ باشد بامحمد ہوشیار'۔''

(دہلی، ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء)

سیّد ساغر مہدی بہرائچی :

''وہ جتنے ممتاز، مشہور ومعروف ماہر قانون تھے اس سے زیادہ سیاسی دوراندیشی، بصیرت اور ادراک کے رمز شناس تھے۔ ۱۹۴۷ء ترک میں وطن اور ہجرت کے ریلے میں بڑے بڑے ثابت قدم ڈگمگا گئے مگر انھیں خاک وطن روکے رہی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک کامیاب ترین وکیل تھے اور اس طور پر معروف بھی تھے مگر ان کے نحیف پیکر میں ایک متبحر عالم دین کا علم، ایک غیر معمولی اور نکتہ رس مفسر قرآن کا ذہن، فارسی اور اردو شعر وادب کے زبردست اسکالر کی نگاہ وبصیرت، تہذیب وثقافت کلچر وروایت کے پروقار امین کا مزاج، مرد مومن کی شان، اظہار حق کی جرأت اور کردار کی قوّت کا حسین امتزاج تھا۔ کیا مجال جو کوئی بھی اردو، عربی، فارسی، انگریزی زبان یا محاورہ، شعر یا نثر، لفظ یا صوت غلط بول کر انکے سامنے سے نکل جائے۔ زبان وبیان پر ایسی زبردست گرفت اور غیر معمولی قدرت رکھنے والے شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے چوٹی کے شعراء کے کلام کا بہترین انتخاب انکی یادداشت کے نگارخانے میں محفوظ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان بزرگ وخورد کے رشتے سے ہمیشہ ایک قابل احترام فاصلہ رہا۔ پھر بھی جب کبھی انکی مجلس میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو انکے غیر معمولی حافظے، انتخاب، پسند، ذوق، نفاست مزاج اور ناقدانہ نظر نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ انھوں نے اپنے جوہر علمی کے کسی قدر حصّے سے اپنے کئی لائق فرزندوں کو مالا مال کر دیا لیکن انکی ذات گھر اور خاندان کی حدود میں مقید کب تھی۔ وہ تو سارے شہر کیلئے مربی اور رہبر تھے، تمام شہر کی نوجوان نسل انکی اولاد کے مثل تھی۔ جو جہاں ملتا حسب ضرورت چند جملوں میں تربیت کی ایک بیش قیمت کرن اسکے حوالے کر دیتے۔ زندگی کا کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ مجھے درپیش ہوتا تو ذہن ودل کو انکی موجودگی سے بڑی تقویت رہتی تھی۔ سہما سمٹا پہونچتا، ڈانٹتے ڈپٹتے اور پھر وہی شفیق اور دلنشیں لب ولہجہ، وہی ہمدردا اور پرخلوص، اپنائیت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی جو ہر مسئلے کا حل بن جاتی تھی اور ہر زخم کا مرہم۔ مگر 'نہ اب بزرگ نہ ناصح نہ غمگسار کوئی، کسی کے ساتھ گئیں آشنائیاں کیا کیا'۔''

(مکتوب مورّخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۷ء)

ہم نے 1989ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہونے والی ایک جرمن مصنّف کرسچین ڈبلیو ٹرال کی کتاب ''مسلم شرائنس ف انڈیا'' میں جو انگریزی اور جرمن دونوں زبانوں میں چھپی تھی بہرائچ میں واقع درگاہ سیّد سالار مسعود غازی پر ایک مفصّل مقالہ لکھا تھا جس میں والد ماجد مرحوم کا بھی خاصا ذکر ہے۔ موجودہ صدی میں شائع ہونے والی ہماری انگریزی اور اردو کی متعدد کتابوں میں بھی انکا خاطر خواہ تذکرہ موجود ہے۔ حالیہ برسوں میں بہرائچ شہر کے مشہور شاعر عبرتؔ بہرائچی صاحب نے اپنی کتاب ''نقوش رفتگاں'' اور ایک نوجوان اسکالر جنید احمد نورؔ سلمہ اللہ تعالی نے اپنی دو جلدوں پر مشتمل معرکۃ الآرا تحقیقی تصنیف ''بہرائچ ایک تاریخی شہر'' کے حصہّ دوم میں ان پر مضامین شامل کئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمایں۔ چنانچہ ہمارے والد مرحوم ومغفور کی عظیم شخصیت اور ناقابل فراموش کارناموں کے باعث انکا نام نامی تاریخ وادب کی کتابوں میں زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

****

(۷)

منظوم گلہائے عقیدت

جیسا کہ ہم سابقہ اسباق میں ذکر کر چکے ہیں ہمارے والد مرحوم مغفور کو فارسی اور اردو شعر شاعری سے بھی زبردست لگاؤ تھا۔ وہ بہت خوش الحان تھے اور حافظؔ شیرازی، عبدالرحمٰن جامیؔ اور علاّمہ اقبالؔ وغیرہ کا فارسی کلام تنہائی میں اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ جامیؔ کی مشہور نعت ''نسیما جانب بطحا گزر کن، زا حوالم محمدؐ را خبر کن'' اور اقبالؔ کی منقبت بی بی بتول ''مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز، از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز'' انکی پسندیدہ چیزیں تھیں جنھیں وہ مسحور کن آواز میں ترنّم سے پڑھا کرتے تھے۔ انکی وفات کے بعد متعدد لوگوں نے انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا جنھیں ہم نے ''حیات محمود'' میں شامل کیا تھا۔ حق ہے کہ انھیں کتاب کی اس تلخیص میں بھی شامل کیا جائے۔ چنانچہ ان منظومات کے منتخب اشعار نذر قارئین ہیں۔

ہے بات کیا آج ہمصفیرو لٹا لٹا سا ہے باغ افسوس
ہے ساقیا سونا میکدہ کیوں پڑے ہیں خالی ایاغ افسوس
سنا ہے بزم حجاز میں کل ہوا ہے گل اک چراغ افسوس
وفات محمود کی خبر سے رہا نہ دل کو فراغ افسوس
خیالؔی کہہ کھینچ کر یہ سرد آہ وکیل نازک دماغ افسوس

(نعیم اللہ خیالؔی)

قوم کی اصلاح کی رہتی تھی تجھ کو جستجو — درحقیقت تو تھا اہل علم وفن کی آبرو
موت ایسی پائی صدہا موت ہوں جس پر نثار — ہو گیا ثابت کہ شخصیّت تھی کتنی پروقار
تیرے اوصاف حمیدہ کا کروں کیسے شمار — نیک سیرت، پاک طینت دیندار و پاسدار
قوم کے دل میں تھا بے شک تیرا بیحد احترام — ہے دعا یہ جنّت الفردوس ہو تیرا مقام
پیش کرتا ہوں تجھے اپنی عقیدت کی نماز — ہو مبارک جانے والے تجھ کو وہ ارض حجاز

(انجم صدیقی)

رہرو دین وشریعت پاسبان مہرباں — عقل ودانش کے دھنی اے رہبر پیر و جواں
بھا گئی تجھ کو رسول اللہ کی یوں سرزمیں — خاک مکّہ میں ہوا ہے آج تو مسکن گزیں
تیرے چہرے پر صداقت کا برستا نور تھا — خانۂ دل روشنیٔ علم سے معمور تھا
تیری شفقت کی یہاں پر شمع تھی جلتی رہی — اسکے سائے میں ہر اک امید بھی پلتی رہی
وقت سے پہلے چراغ زندگی گل ہو گیا — موت کی گھاٹی میں سارا حوصلہ ہی سو گیا
تو گیا ملک عدم بے معنی و بے سود ہے — تو ہے زندہ آج تک معروف ہے محمود ہے

(شاردا پرشاد سنگھ شیداؔ)

افسوس چل بسے اب محمود بندۂ رب — وہ عامل شریعت وہ حامل طریقت
تھے مرد نیک وصالح رکھتے تھے قلب مومن — ظاہر میں پاک صورت باطن میں پاک طینت
تھے عاشق محمدؐ رکھتے تھے درد ملّت — چھوٹے بڑے سے انکو بےلوث تھی محبت
مدت سے آرزو تھی مکّہ مدینہ جایں — آنکھوں سے اپنی کرلیں حرمین کی زیارت
صادق طلب تھی ان کی اللہ کی مدد سے — پہونچے حجاز میں وہ برآئی دل کی حسرت
ارکان حج تھے جو بھی وہ کر چکے تھے پورے — تھے خوش نصیب کیسے حاصل ہوئی سعادت
اٹھارویں دسمبر ذی الحج کی چودھویں تھی — یوم الخمیس آیا لے کر پیام رحلت
جب نیند سے اٹھے وہ تھا وقت صبح صادق — عجز و نیاز سے کی پھر اللہ کی عبادت
حق کی طلب کا مژدہ آئی اجل جو لے کر — لبّیک کہہ کے اٹھے وہ پیکر عقیدت
راضی رضائے حق پر ہردم رہے ہمیشہ — روح الامیں نے آ کر جنّت کی دی بشارت
آرام کر رہے ہیں مکّے کی سرزمیں میں — سایہ فگن نہ ہو کیوں مدفن پہ ابر رحمت
تھی مصطفیٰؔ کو فکر تاریخ سال رحلت — آئی ندائے ہاتف 'زاہد غریق رحمت'

(مصطفیٰ حسن تاثیرؔ)

حج سے جو ہوئے فارغ پیغام اجل آیا — مقبول خدا تھے وہ جنت میں ملی مسند
افسوس کہاں ایسا ملتا ہے بھلا انساں — جو قال میں زاہد ہوا ور حال میں ہو سرمد
گو مل نہ سکا پر تھا مدّاح اثیرؔ انکا — تاریخ ہو رحلت کی تھی فکر اسے بے حد
مصرع یہ لکھا دیکھا پھر دیدہ و دل ہی میں — گلشن میں ہیں جنّت کے محمود حسن سیّد

(مصطفیٰ حسن تاثیرؔ)

بود جس کی رہی دنیا میں وہ ہو گا نابود — روز ہوتا ہے تماشہ یہ تہہ چرخ کبود
بھول سکتا ہے مگر کون بھلا ان سب کو — جن کو مطلوب تھی بس خلق خدا کی بہبود
آج ہم نے یہ سنا ہے کہ سوئے خلد بریں — چل دئے ہیں بہ رہ کعبہ جناب محمود
مل گئی ارض مقدّس میں انھیں قبر کی جا — اور کیا اس سے زیادہ ہو سعادت کا وجود
اے خدا بہر رسولؐ دوسرا ہادی کل — خلد میں ارفع و اعلیٰ ہو مقام محمود

(نانپارہ کے ایک نامعلوم شاعر)

****

(۱۰)

منظومات مصنّف

نذر اسلاف

ہے لازوال مرے خاندان کی خوشبو
حسب نسب کی وہ نام ونشان کی خوشبو
حیات بخش وہ کچّے مکان کی خوشبو
سفید اجلے لباسوں میں عطردان کی خوشبو
مہکتی گھر میں حدیث وقرآن کی خوشبو
خدا رسول کے ہر دم بیان کی خوشبو
مرے بزرگوں کی بولی میں پھولدان کی خوشبو
وہ سوندھی سوندھی سی اودھی زبان کی خوشبو
دلوں میں زندہ وجاوید ہیں مرے اسلاف
نہ مٹ سکے گی کبھی ان کی آن بان کی خوشبو

****

دادا حضور کیلئے

کس قدر روشن دماغ اور کس قدر روشن ضمیر
سارے گھر کے واسطے رحمت ہوئے دادا حضور
کیا حکیمانہ نظر تھی کیا فقیرانہ مزاج
نقش دائم چھوڑ کر رخصت ہوئے دادا حضور

****

والدہ مرحومہ کی یاد میں

عہد طفلی کی امنگوں پر شباب آیا نہ تھا
زندگی میں میری کوئی انقلاب آیا نہ تھا
رنج وغم سے بندۂ آزاد کو کیا کام تھا
کھیلنا پڑھنا سیاحت زندگی کا نام تھا
دفعتاً پھر آگیا اک ایسا ظالم انقلاب
عہد طفلی ہو گیا برباد طوفان شباب
میری بی امّی نے اس دنیا سے پردہ کرلیا
زندگی اک دھوپ تھی رحمت نے سایہ کرلیا

****

حرم کا مہمان

فضائیں ہیں بوجھل سماں رو رہا ہے
زمیں اشکبار آسماں رو رہا ہے
تھا بہتوں کو روتے سے جس نے چپایا   سبق جس نے صبر ورضا کا پڑھایا
شریعت میں گریہ منع ہے بتایا   مصیبت میں بھی خوش رہو یہ سکھایا
اسی کی جدائی سے مغموم ہو کے
ہزاروں کا ایک اک رواں رو رہا ہے
رہا خود جو ثابت قدم ہر الم میں   سنبھالا دیا جس نے بہتوں کو غم میں
تھی مرہم کی تاثیر جس کے قلم میں   وہ خود سو گیا آج ارض حرم میں
حرم اپنے مہمان پر ناز کر لے
وطن میں تو پیر و جواں رو رہا ہے
عبادت میں عمر اپنی جس نے گزاری   چلی سوئے فردوس اسکی سواری
چمن میں گلوں کو ہوئی بے قراری   فضائے اودھ میں گھلی سوگواری
یہ کون اٹھ گیا آج اپنے چمن سے
کسے کھو کے ہندوستاں رو رہا ہے
ہزاروں کو سوتے سے جس نے جگایا   پڑے تھے جو غفلت میں انکو اٹھایا
جھنجھوڑا صحیح راستے پر لگایا   اسی کو ہے دست اجل نے سلایا
یتیمی کا داغ اپنے ماتھے پہ لے کے
مکیں رو رہے ہیں مکاں رو رہا ہے
نبیؐ نے شفاعت کا مژدہ سنایا   خدیجہؓ نے ممتا کا دامن بچھایا
صحابہ نے دست رفاقت بڑھایا   تو بطحا کا راہی پلٹ کر نہ آیا
بچھڑ کے مگر میر محفل سے اپنے
عزیزوں کا اک کارواں رو رہا ہے

****

جنون جذبات

ہم نے اس بندۂ مومن کو تھا جتنا سمجھا   ہم سے آداب کو ملحوظ نہ رکھا جائے
یہ ہے بے جا نہ غلو اور نہ عقیدت اندھی   اس حقیقت کو تعصّب تو نہ سمجھا جائے
دین و دنیا کے کمالات کے مجموعے کو   کہہ رہے ہیں یہ ملائک چلو دیکھا جائے
آج آغوش حجازی میں وہ بندہ آیا   جسکے مبلغ کو فرشتوں سے نہ پرکھا جائے

****

یادِ ماضی

چلتی پھرتی مجسّم دعا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے
زندگی کا سلیقہ سکھاتا تھا جو   ہر اندھیرے میں رستہ سجھاتا تھا جو
حوصلے ہر قدم پر بڑھاتا تھا جو   آندھیوں میں بھی دیپک جلاتا تھا جو
اس صنوبر کی ٹھنڈی ہوا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

اسکے دم سے چمن اپنا رشکِ ارم   پرورش غنچۂ وگل کی اسکا دھرم
تند جھونکوں میں بھی ماں تا کا بھرم   وہ مجسّم عنایت نوازش کرم
لطف واکرام کی انتہا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

زندگی کے ترانوں میں شعر وادب   بندگی کے تقاضوں میں غیض وغضب
غنچۂ وگل کی توقیر بھی ماوجب   علم کی پیاس بجھتی تھی واں بے طلب
چشمِ بینا کی فہم و ذکا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

علم وحکمت کی چھٹکی ہوئی چاندنی   فہم ودانش کی بجتی ہوئی راگنی
دردِ دل پند وتادیب کی چاشنی   خفگیاں ظاہری شفقتیں باطنی
تربیت کی انوکھی ادا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

دین ودل کی کہانی کہی جاتی تھی   گفتگو دوستانہ سی کی جاتی تھی
رائے چھوٹے بڑے سب کی لی جاتی تھی   حسبِ موقع جو کلیوں کو دی جاتی تھی
وہ دعا یاد ہے وہ دوا ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

سایۂ عاطفت میں تھیں کلیاں مگن   دین و دنیا بنانے کی ہر دم لگن
جشنِ رمضان کا عید کا بانکپن   بیت بازی کی لے درسِ قرآں کا فن
نورافشاں چمن کی فضا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

مشکلوں میں بھی ہنسنے ہنسانے کی دھن   کھیل ہی کھیل میں کچھ سکھانے کی دھن
سیّدہ فاطمہ کے ترانے کی دھن   لحن بانگ درا شاہنامے کی دھن
گونجتی گھر میں حمد و ثنا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

کیوں ستاتا ہے یوں عہدِ رفتہ ہمیں   نکہتِ گل کرے دل گرفتہ ہمیں
یاد کرتی ہے کس کی فسردہ ہمیں   ہم بساطِ چمن کے پیادہ ہمیں
موسمِ گل کا دیکھا سنا یاد ہے   گھر میں اک مردِ درویش تھا یاد ہے

****

زیارت مزار

جوارحرم میں جہاں آپ سوئے — وہاں ہم نے اشکوں کے موتی پروئے
بہت یاد آئے وہ شفقت کے لمحے — کہ جو خواب غفلت میں تھے ہم نے کھوئے
ادا کر سکے ہم نہ حق تربیت کا — ندامت سے قدموں پہ سر رکھ کے روئے
برستا جو تربت پہ اک نور دیکھا — تو تر ہو کے اس میں گنہ سارے دھوئے

****

نذر وطن

مری حیات کا ہر پل عطائے بہرائچ — مرے دکھوں کا مداوا دوائے بہرائچ
قدوم سیّد سالار کا خزینہ ہے — ہے نور حق سے منور ضیائے بہرائچ
ہے علم وفن کی روایات کا امیں یہ شہر — ادب نواز ہے یار و ہوائے بہرائچ
یہ شہر الفت باہم کا درس دیتا ہے — ہے پاس وضع کا گڑھ آبنائے بہرائچ

****

علم کا خزینہ ہے سرزمین بہرائچ — فضل کا نگینہ ہے سرزمین بہرائچ
حسن ساری دنیا کا اسکے حسن پر قرباں — ایسا آبگینہ ہے سرزمین بہرائچ
کسب علم کا جذبہ آ کے یاں نکھرتا ہے — بام فن کا زینہ ہے سرزمین بہرائچ
کیسی کیسی صورتیں خاک میں ہیں خوابیدہ — علم کا دفینہ ہے سرزمین بہرائچ

****

وطن کا حال جب کوئی ہمیں آ کر بتاتا ہے
تو دل ماضی کی یادوں میں ہمارا کھوسا جاتا ہے
نہ جانے کتنی پرتیں ذہن کی پھر کھلنے لگتی ہیں
نگاہوں میں پھر اس نگری کا نقشہ آسماتا ہے
وہ دالان اور وہ کمرے وہ آنگن اور چوبارے
بڑے جن میں ہوئے تھے انکے قصّے دل سناتا ہے
وہ گھنٹہ گھر وہ بازار اور وہ درگاہ کا پھاٹک
نگاہوں میں شہر کا چپّہ چپّہ گھوم جاتا ہے
لڑکپن جن میں گزرا تھا وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکر بہرائچ کا آتا ہے

****

****

جنونِ آگہی کی یادگار چھوڑ جاؤں گا
صبا کے لب پہ نغمۂ بہار چھوڑ جاؤں گا

رواں رہے گا کاروانِ شوق میرے بعد بھی
سجا کے نقشِ پا سے رہگذار چھوڑ جاؤں گا

****